

ملک محمد یحییٰ
لطیفہ خانم صدیقہ

میری لائبریری

عکس اقبال

تصانیف اقبال کے عمیق
مطالعے کے روشنی میں
پیام اور تعلیمات اقبال

میری لائبریری میں
پہلی بار

عکس اقبال

مُصَنِّعُ

ملک محمد عظیم بی، سی، ایس
لطیفہ خانم صدیقی ایم، اے

مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲

جملہ حقوق شامعہ دہلی کی صفین محفوظ ہیں

ناشر: بشیر احمد جودی، ڈاکٹر کتب خانہ میری لاہور

طبع: آری بشیر پرنٹرز لاہور ۲

بارلوک، ۱۹۷۵

انتساب

پہراں و دخترانِ عزیز

سعد - وقار - شلا اور تسنیم کے نام
جن کی محبت شاد اور عزم مصمم کا جذبہ اس کتاب
کی تکمیل میں ہلکے لئے ہمت افزا رہا۔



ضمیرِ مغرب، تاجرانہ، ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہِ محط، یہاں بدلتا نہیں زمانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلمان، بنا کے تقدیر کا بہانہ

فہرست مقالات

۱	پیش نقطہ	۹
۲	علامہ اقبال سراخ اور سچی منظر	۱۹
۳	ابتدائی اردو کلام	۲۹
۴	حکیم مشرق	۴۲
۵	اقبال اور اقوام مشرق	۶۲
۶	عالم مشرق و مغرب - اقبال کی تعلیم	۷۳
۷	وہاٹے ساز	۸۸
۸	متغیر کائنات	۱۰۳
۹	اسلامی روایات	۱۱۹
۱۰	مشکل پسندی	۱۳۰
۱۱	عقلمند خودی	۱۳۹

۱۵۳	فلسفہ خودی اور تصورِ حق	۱۲
۱۶۵	الیسیت اور عبادت	۱۳
۱۶۲	مذہب کیونکر ممکن ہے	۱۴
۱۶۶	مذہبی تجربے کی ماہیت اور خصوصیات	۱۵
۱۸۲	روحانی تجربے کا منطقی جواز	۱۶
۱۸۷	انسانی شخصیت کی بے پناہ قوت	۱۷
۱۹۳	نکریۃ اجتماع	۱۸
۱۹۹	مسلم کلچر	۱۹
۲۰۸	شاعر کا خواب	۲۰

پیش لفظ

ہماری پچھلی تصنیف ”رہ وادہی خیال“ ششہ امر میں چھپیں، تب سے اب تک
 مجددانہ حالات کافی تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنف کی کوئی بہت بڑائی
 ہوئی ہو یا نہ ہوئی، ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا۔ ہمارے لئے یہی امر باعث غمازیت
 ہے کہ جن نظریات کو ابھارنے کی کوشش اُس کتاب اور اُس کے پیش لفظ میں کی گئی
 تھی، انہیں قوم نے کافی حد تک شرف قبولیت بخشا ہے۔ ادب اور مقصد کی تفصیلی
 بحث کے دوران یہ کہا گیا تھا کہ ادب میں مقصدیت اور تفریح کے عناصر کا حسین امتزاج
 ہونا چاہئے۔ ادب کو محض تفریح طبع کا ذریعہ سمجھ لینا ادب کے بلند مقاصد کے خلاف ہے
 کسی اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی سعی چاہے کتنی ہی دہی ہوئی لڑکی صورت میں کیوں ہو
 لازمی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ادب کے ذریعے دیگر اعلیٰ مقاصد کے حصول

اگر اسلامی مساوات اور اسلامی سوشلزم یا اسلامی روایات اور روحانی تجربات کا پرچار بھی کیا جائے تو سب اُس ادیب کو گروں زدنی قرار نہیں دیا جانا چاہئے کیونکہ علامہ اقبالؒ نے بھی تو اسلامی مساوات کے گیت گائے ہیں اور خود قائد اعظمؒ نے پاکستان کے قیام کے بعد واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ پاکستان میں اسلامی سوشلزم کی بنیاد پر معاشرہ ترتیب دیا جائے گا۔

پھر ایسا کیوں ہے کہ اسلامی مساوات و روایات یا اسلامی سوشلزم کا نام لینے والوں کی اس قدر سرکوبی کی فکر کی جائے کہ ان کا حشر و کیکہ کر کوئی اور ان باتوں کا ذکر تک نہ کر سکے۔

ہیں اس بات پر بجا طور پر غور ہے کہ حالات کے دھارے نے صحیح رخ پر پیش کھایا ہے اور ہمارے ملک میں اب ایسی صورت درپیش ہے کہ اسلامی روایات اور اسلامی سوشلزم اور اسی طرح اسلامی روایات اور روحانی تجربات کا نام لیا جانا کسی طرح بھی فقط تصور نہیں کیا جاتا۔ ہم اس بات کا دعویٰ تو نہیں کرتے کہ یہ سب کچھ ہمارے زورِ قلم کا نتیجہ ہے یا اس قسم کے خیالات کے پرچار کو گناہ نہ سمجھنے والے ادیبوں کا تجربہ طور پر جادو ہے کہ ملک کی کاپیٹل ہو گئی ہے اور احتفال کا چاہے وہ ذراعت میں ہو تجارت میں ہو یا ملازمتوں میں واضح طور پر خانہ شروع ہو گیا ہے۔ اس مل کے نکل ہونے میں کتنا عرصہ لگتا ہے اس بارے میں ابھی کچھ کتنا قبل از وقت ہو گا۔ مہر حال یہ امر بالکل واضح ہے کہ ہمارا خونِ جگر انکس نہیں گیا اور قوم کو ترقی کی صحیح سمت مل گئی۔ اس سلسلے میں ملک کو صحیح اور نہایت جاندار قیادت کا مل جانا بھی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ ہمارے لئے یہی سببوت کافی ہے کہ قوم کو ترقی و تعمیر کی نئی راہیں مل گئیں۔ اگر قوم و ملک مذہد

پایندہ ہیں تو اپنی انفرادی مشکلات اور بے وجہ منافقتیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں جو کہ ان میں پائیداری کا ناپید ہو ملازمی امر ہے۔ سچ اور حق آخر اپنا اثر کرتا ہے اور منہج آخر حق کی ہی ہوتی ہے۔

اِنَّ الشَّامَعَ الشَّابِرِیْنَ

علا سراقبال فرماتے ہیں کہ

پالتا ہے بیچ کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
 کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے کھاب ؟
 کون لایا کھینچ کر گھتسم سے باد ساز گار ؟
 خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
 کس نے بھردی موتوں سے خوشتر گندم کی جیب ؟
 مومنوں کو کس نے سکھائی ہے خوں انقلاب ؟
 وہ خدا یا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
 تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں ، میری نہیں

وہ جان کی عظمت اور مزبور کی شان کو اس سے زیادہ خوبصورت طریقے پر اور کون بیان کر سکتا ہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ محنت کرنا اور پیداوار میں اضافے کی سچی کرنا خدائی صفات کو اپنانے کے مترادف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان فرمایا کہ انگریز حاکموں کی محنتی ہونی بجا مذاویں چاہے وہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی صورت میں ہوں چاہے نوآبادی اور خانہ بھادری کے القابات کی صورت میں ، انھیں زمین کا یا اس پر بسنے والے لوگوں کا حاکم یا مالک نہیں بنا سکتیں۔ زمین تو سب اللہ کی ہے اور اس سے منادہ

اٹھانے یا اُس کی ملکیت کا حقدار وہی ہے جو اُس پر خدائی صفات کو بروئے کار لاتے ہوئے محنت و مشقت کرتا ہے اور اس طرح لوگوں کو مالکِ ارض و سما کے مفیل، روزی پہنچانے کا وسیلہ بنتا ہے۔ یہ امر باعثِ طہانیت ہے کہ ذریعہ اصلاحات کے تحت وسیع و عریض قطعہ ہائے اراضی جو بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی بے توقبی کی وجہ سے بخر چڑھے تھے اور بے توقبی کا شکار تھے، اب مزدورین کو تقسیم ہو چکے ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ اصلاحات میں اراضی فی فرد کی بجائے اراضی فی کنبہ کے حساب سے حد مقرر کی جائے گی۔ جدید سے جدید مشینی آلات اور کھاد کے استعمال سے ویسے ہی زرعی پیداوار کی آمدنی بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ لہذا زمین کی ملکیت کی اسکا فی حد کم سے کم مقرر ہونی چاہئے۔ آج کل کے حالات میں اگر اسے سوائیکڑ فی کنبہ کر دیا جائے تو کسی طرح بچاؤ ہو گا۔ آمدنی کی مساوی تقسیم کے سلسلے میں یہ ایک نہایت اہم قدم ہو گا۔ اسی طرح خوں اور فیکٹریوں کے مزدوروں کا جو حصہ ملک کی معیشت میں ہے اس سے انکار کرنا سوسائٹی کے ساتھ ظلم کے مترادف ہو گا۔ صحیح معنوں میں قوم کے پیداوار کی کثیر سے اہم، مگر اگر کوئی ہیں تو مزدور ہیں لیکن کتنے انھوں کی بات ہے کہ اگر آمدنیاں اور تنخواہیں بڑھتی ہیں تو ہمیشہ موٹی موٹی تو تندرالے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والے سرمایہ داروں یا اسی قبیل کے مغرور مفادات کی بڑھتی ہیں۔ اگر بغیر غائر دیکھا جائے تو ان سرمایہ داروں نے اپنے پاؤں پر کھڑی ماری ہے اگر یہ لوگ مزدوروں کو مناسب تنخواہیں دے کر انھیں اسلامی طریقے پر خوش رکھتے جس کے وہ ہر گھانا سے اہل تھے تو آج مزدور خود اُن کے حق میں مظاہرے کرتے اور اُن کی بقا کے لئے دعا گو رہتے لیکن انھوں نے ان عاقبت نااندریش خدا یا ان صنعت نے امتیازی دھنائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹوٹ

کھسوٹ کا وہ بازار گرم کیا کہ المی تو بہ! غضب خدا کا کہ ایک مل کی آمدنی سے ایک دو سال ہی میں وہ ایک اور مل نکال دیتے تھے لیکن پیداوار کے اصل خالق یعنی ان کو دہشتہ بنانے والے اصل کارکن سب کو مارتے تھے اور چھ چھ ماہ میں ہی قلوں کی ناگفتہ بہ حالت کام کی زیادتی، غیر منظمی، بخش ماحول اور حقیر تنخواہوں کے سبب تپ دق میں مبتلا ہو جاتے لیکن شعلہ قلب اور سنگدل مل مالکان سے یہ نہ ہوتا کہ ان کی تنخواہیں اس حد تک کم آئیں کہ ان کا کنوؤں کی زندگی عذاب نہ بنے۔ آخر مغربی یورپ اور امریکہ میں بھی تو بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں لیکن انھوں نے اپنے کارکنوں سے کنوؤں سے بھی بد سلوک کیا؟

بنیادی اور بھاری صنعتوں مثلاً شیل قلوں، کھاد کی فیکٹریوں، الیکٹرکس اور گیس کمپنیوں، سینٹ اور بھاری انجنیئرنگ کے کارخانوں اور گیس کی قلوں وغیرہ کو قومی ملکیت میں لینے کے اقدامات نہایت مستحسن ہیں۔ اسی طرح بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لینا نہایت اہم، صحیح اور بروقت اقدام ہے۔ ان اقدامات سے ایک طرف قومی خزانے کی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا اس کے علاوہ بہت زیادہ سرمایہ حکومت کے ہاتھ آجائے گا جسے ملکی تعمیر و ترقی کے کام میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم سمجھتے ہیں کہ ٹیکسٹائل قلوں اور کاشت کی قلوں کو بھی قومی ملکیت میں لے لینا چاہئے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ بھاری اگر کوئی صنعت ہے تو وہ ٹیکسٹائل قلوں کی صنعت ہی ہے اور یہی صنعت اگر چاہتی تو مزدوروں کی فلاح اور کپڑے کے مناسب دام رکھ لینے کے باعث ملک میں دیگر صنعتوں کے لئے ایک مثالی نمونہ پیش کر سکتی تھی کیونکہ جس قدر بے پناہ آمدنی انھوں نے حاصل کی ہے شاید اور کسی نے نہ کی ہو لیکن تنخواہ دیتے وقت تو انھوں نے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ انھوں نے خوشہ دیوار پڑھا ہی نہیں، علامہ اقبال

نے کیا صحیح فرمایا ہے :

بندۂ مزدور کو جب کہ مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سدا یہ دار حیلہ گر
شاخِ آبِ پرہی صدیوں تک تیری برات
دستِ دولتِ آفریں کو مزدویوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الحوط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسلِ قومیت نکلیا، سلطنتِ تہذیب، رنگ
”خواجگی“ نے خوب چُنی چُن کر بنائے مسکرات
کٹ مرانا داں خیالی دیوتاؤں کے لئے
جنگِ کی لذت میں تو کٹوا گیا نقدِ حیات
مسکوکِ چالوں سے بازی لے گیا سراپا دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
آنکھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آواز ہے

”دیوِ ادبی خیال“ کے چشِ نقد میں یہ سوال بھی اُٹھایا گیا تھا کہ ترقی کے مراکز اور
بنیادی آسائشیں صرف بڑے بڑے شہروں مثلاً کراچی، لاہور اور اسلام آباد تک ہی کیوں

محدود ہیں اسی سلسلے میں بھی صحیح قدم اُٹھایا گیا ہے اور DECETERLISATION یعنی ضرورت سے زیادہ مرکزیت کو کم کرنے کے سلسلے میں چار صوبوں کے الگ الگ دارالتسلط ہیں اور ہاں الگ بنیادی آسائشوں کے مراکز قائم ہیں اس کے علاوہ DECETERLISATION کی ایک اور نہایت اہم صورت یہ ہے کہ ہر ضلع کے تمام سب ڈویژنوں کو ضلع کا درجہ دیا جائے اس سے ایک تو یہ ہو گا کہ ضلع ہیڈ کوارٹر کی تمام آسائشیں مثلاً لڑکوں لڑکیوں کے کالج، انسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال اور ضروری صنعتیں اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ وغیرہ وہاں بھی قائم ہو جائیں گے۔ اخبارات اور کھیلوں کی ویسی ہی آسائشیں وہاں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ بجائے اس کے کہ صوبائی آمدن کے اضافے کے ساتھ ساتھ ہم صرف صوبائی سیکرٹریٹ کے عمل اور اخراجات میں بے پناہ اضافہ کرتے جائیں سبتر صورت یہی ہے کہ اس اضافی آمدن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم ہر سب ڈویژن کو ضلع کا درجہ دے دیں۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ شعروں کو ترقی کرنے کا موقع ملے گا بلکہ نئے اور پرانے ضلع کے صدر مقام کے لئے کم سے کم بنیادی سہولتوں کا ایک معیار مقرر ہونا چاہئے جن کی وہاں پر سہولتیں جلد از جلد ضروری قرار دی جائے۔ اسی طرح ان جملہ نئے ضلعوں میں تین تین سب ڈویژن یا تحصیل ہوں جنہیں سب ڈویژن کے درجے کی کم سے کم بنیادی آسائشیں سبم پہنچانے کا بہت جلد اہتمام کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کل کے ضلعوں کے صدر مقام اس قدر زیادہ COMPLETED اور گنجان آباد ہو چکے ہیں کہ اس مرکزیت کو ختم کرنا انتہائی ضروری ہے اور ترقی کے نئے نئے مراکز قائم کرنا وقت کی آواز ہے۔

علامہ اقبال کی تقریباً تمام تصانیف نظم و نثر کا ایک مختصر سی کتاب میں ترقیدی تجزیہ پیش کرنا بلاشبہ دریا کو کوزے میں بند کرنے اور سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے

جبریل اقبال کے شائقین اور طلباء اس حقیر کوشش کو انشاء اللہ اپنے مقصد کے لئے نفع مند و معاون پائیں گے۔ علامہ اقبال نے اردو اور فارسی نظم میں دس کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں :-

۱۔ بانگ درا

۲۔ پیام مشرق

۳۔ جاوید نامہ

۴۔ منزلِ کلیم

۵۔ بالِ حیرل

۶۔ پس چہ باید کرد اسے اقوامِ مشرق مع ثنوی مسافر۔

۷۔ اسرارِ خودی

۸۔ رموزِ بے خودی

۹۔ زبورِ عجم

۱۰۔ ارمغانِ حجاز

ان کے علاوہ علامہ کے لیکچرز کا مجموعہ ہزبانِ انگریزی بعنوان :-

RECONSTRUCTION OF ISLAMIC THOUGHTS IN ISLAM

اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنی کہ ان کی تصانیفِ نظم۔ اس میں شامل ساتوں لیکچر ایسے ہیں کہ ان کا ایک ایک لفظ ہیرے جواہرات میں تولے جانے کے قابل ہے۔ ان سب تصانیف اور لیکچرز پر الگ الگ ایک ایک مقالہ تحریر کیا گیا ہے جسے حسبِ حال عنوان دیا گیا ہے۔ ایک مقالہ ان کے نہایت اہم سیاسی خیالات سے متعلق ہے۔ کتاب کو زیادہ مبسوط

بنانے کے لئے ایک مقالہ ان کے حالات زندگی سے متعلق بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ زبان کو عام فہم اور سادہ رکھا گیا ہے تاکہ اس عظیم مفکر کا پیغام آسانی سمجھا جاسکے اور خصوصاً طلباء غیر فلسفی قسم کے غواتین و حضرات اس پر مکتل مہارت حاصل کرنے میں کوئی مشکل محسوس نہ کریں۔

آخر میں یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہو گا کہ گزشتہ تصنیف ”رہِ داویٰ خیال“ میں بطورِ معصفت صرف عمرِ عظیم کا ذکر تھا اور پیش نظر میں بیگم عظیم کے CONTRIBUTION کے سلسلے میں انھیں غورِ تحقیق میں پیش کیا گیا تھا۔ اس پر اگر شوقِ بیشتر اعتراف اور طے دالوں کہ یہ اعتراف تھا کہ جب CONTRIBUTION دونوں کی ہے جیسا کہ پیشتر نے اشارہ کیا ہے اور خود پیش لفظ بھی واضح طور پر اس کی غمازی کرتا ہے تو دونوں کا نام بطورِ معصفت درج کیوں نہیں کیا گیا لہٰذا اس بار دونوں کا نام بطورِ معصفت درج کر دیا گیا ہے اُمید ہے پڑانے اعتراف کی اب تلافی ہو جائے گی۔ تاہم ہمیں اس امر پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں کہ دوسرے فاضل مصنفین کی بیویاں بھی اپنے شوہروں کی تصانیف میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور نام صرف شوہروں کا ہو اور یا یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ شوہروں کو توفیق دے تو وہ معصفت اور ادیب قسم کی بیویوں کی تصانیف میں بھر پور حصہ لیں اور نام صرف بیویوں کا ہونے دیں۔ آخر دونوں کے تعاون سے ادب کی کچھ خدمت ہو جائے تو ہرج ہی کیا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ادب تعمیری اور تخلیقی ہو تحفہ ہی ہرگز نہیں ۷

گر ہنرمیں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وانے صورت گری و شاعری و نائے سود

کتب و میکرو جزدورس بنودن ندر بند
بودن آموز که ہم باشی و ہم خوابی بود

محمد عظیم - پی - سی - ایس
بیگم عظیم - ایم - اے

یکم فروری ۱۹۷۳ء لاہور

علامہ اقبال — سوانح اور پس منظر

ہندوستان میں سات سو سالہ اسلامی دورِ حکومت کے بعد ۱۵۱۹ء میں جب بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کے ہاتھوں شکست کا سامنا ہوا تو اس کے ساتھ ہی برصغیر میں مسلمانوں کا زوال و افح طور پر شروع ہو گیا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ایک مسلمان بلو شاہت کا خاتمہ ہوتا تو دوسری مسلمان بادشاہت سرحد میں آجالتی اور جب اس کا عہد ختم ہوتا تو کوئی اور عظیم مسلمان فاتح اٹھتا اور ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالتا۔ گویا محمد بن قاسم سے لے کر اورنگ زیب تک مسلمان بلا شریک غیرے ہندوستان کے وسیع علاقوں پر حکمران رہے۔ ایشیا افریقہ اور یورپ کے وسیع علاقوں کی طرح ہندوستان بھی اسلامی عروج کے عہد کے زیر اثر آیا اور بلاشبہ اسلامی ہندوستان کو اس بر غظیم کی تاریخ کا سنہری زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ خصوصاً مغلوں کے زمانے میں اسلامی تہذیب و ثقافت اپنے عروج پر پہنچی۔ مغل عمارتیں، معصوری، ادب، موسیقی اور دیگر علوم و فنون

غرضیکہ مغلیہ دور میں اسلامی کلچر اپنے عروج پر پہنچا۔ اور ہنگویہ عالمگیر کے انتقال کے بعد اگرچہ مرکز میں مغلوں کی سلطنت باقی رہی اور مختلف ریاستوں میں بھی وسیع علاقوں پر مسلمان نواب اور سردار قابض رہے لیکن پھر بھی انگریزوں کا دور دروز بروز بڑھتا گیا اور بالآخر ~~۱۷۵۷ء~~ میں انگریز اپنی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور پھوٹ ڈھولانے کی کامیاب پالیسی کے باعث مسلمانوں کو شکست دے کر یہاں پر پورے ایک سو سال کے لئے براجمان ہو گئے۔

۱۷۵۷ء کی جدوجہد کو انگریز توغدر کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن وہ بلاشبہ ہندوستان والوں کے لئے جنگِ آزادی کی حیثیت رکھتی ہے۔ مقامی آبادی کے ایک کثیر حصے نے بہادر شاہ ظفر کی زیر سرکردگی انگریزی راج کا تختہ الٹ دینے کی سعی کی لیکن ان کی سیاست کام آئی اور بہادر شاہ شکست کھا کر گرفتار ہوئے۔ ان کے کئی بیٹوں عزیزوں اور سہ سالہ دلوں کو نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا گیا، خدائے اقدس اور ان کی بیگم کو رنگون میں جلا وطن کر دیا گیا جہاں وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اشد کو پیارے ہوئے۔ سقوطِ دہلی کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو خاص طور پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ غالب اپنے خطوط میں لکھتے ہیں کہ جب مسلمان آبادی کو شہرِ جد کر دیا گیا اور بغیر تادانی لئے اور دفاع داری کا تقبیل دلائے خوب چھان بین کئے بغیر کسی کو دو بارہ شرمیں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی مسلمانوں کی جائیدادیں بخلعتیں اور جاگیریں وغیرہ ضبط کر لی گئیں۔ غرض یہ سانحہ مسلمانوں کے لئے قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔

اس شکست کے بعد مسلمانوں پر یاس و حماں کا شدید سکوت طاری ہوا۔ انگریزی تعلیم اور جدید علوم و فنون سے انہوں نے مکمل طور پر بائیکاٹ اس نقطہ نظر سے کیا کہ وہ انگریزوں

سے سخت متنفر تھے اور ان کے مکمل طور پر انگ تلنگ رہنا چاہتے تھے۔ اگر نیک ملازمت کرنے کو انہوں نے کفر جانا یہاں تک کہ انگریزوں سے ملنے جلنے تک سے اجتناب کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی پالیسی یہ رہی کہ مسلمانوں کو مکمل طور پر کھٹا جلے، کیونکہ اگر انہیں خطرہ تھا تو صرف مسلمان قوم سے مسلمانوں ہی سے انہوں نے سلطنت جینیسی تھی اور انہیں یقین تھا اگر مسلمان قوم کو پوری طرح کھل دیا گیا تو وہ اپنے خلاف اس جوہر استبداد کا جلد فروغ لے گی۔ چنانچہ اس پالیسی کے تحت انہوں نے مسلمانوں کو ملازمتوں، تجارت کی سوسلوں اور دیگر سیاسی مراعات سے مکمل طور پر محروم کر دیا اور تنہا ہی عرصے میں انہیں اس ذلت کو پہنچا دیا کہ وہ صرف ماشکی دھوبی، مزدور اور کتہ بان قسم کی چیزیں بن کر رہ گئے اور وہ دن اور رات کے کراؤ کا شہر بھی نہیں کے مسلمانوں کا سا ہو۔

ایسے نازک موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمان قوم کو چند ایسی شخصیتوں سے نوازا جنہوں نے مسلمانوں کی اس علیحدگی پسندی اور جدید علوم و فنون سے نفرت کے دور رس نتائج کو بھانپ لیا۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ اس رویے کی وجہ سے ہندو قوم جو امتیازی چالاک اور عیار ہے، ترقی کی لہر میں مسلمانوں سے بہت (یا وہ آگے نکل جائے گی اور ایک وقت ایسا آجائے گا کہ ہندو پورے ملک پر چھپ جائیں گے اور اگر انگریز کبھی حالات کی مجبوری کے باعث ہندوستان سے پوریا بستر بانہ کر دے تو ہندو ہی پورے ملک کے مالک بن بیٹھیں گے۔ چونکہ مسلمان دینی، قبائلی اور اقتصادی بد حالی کے باعث کسی گنتی میں نہیں رہیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے سرسید نے مسلمانوں کی اس علیحدگی پسندی کے رویے کے خلاف ملحد بغاوت بلند کیا۔ انہوں نے غلامی سے کفر کے فتنے بھی اٹھائے اور

اپنے آپ کو ابن الوقت بھی کہتا یا لیکن مسلمانوں کو صحیح ۱۱ھ پر ڈالنے کے عزم کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ انھوں نے ”اسباب بغاوت ہند“ میں جو ان کی شہرۂ آفاق تعینات انگریزوں پر بھی واضح کیا کہ اگر بغاوت ہوئی تھی تو ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ انگریز حکمرانوں کی بھی اس میں غلطیاں لازمی طور پر موجود تھیں۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ مسلمانوں کو تباہ کرنے کی پالیسی خود انگریزوں کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ صرف ہندو قوم کو اتنا زیادہ مضبوط بننے کا موقع نہ مل سکے کہ وہ انگریزوں کے لئے بھی مصیبت بن جائے اور ہندوستان کی دیگر قوموں کے لئے بھی بلائے جہاں انھوں نے مسلمانوں کو بھی جدید علوم حاصل کرنے پر اکسایا اور ملازمتوں اور تجارت میں اپنا حصہ حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اپنے انگلستان کے دورے میں انھوں نے آکسفورڈ اور کیسبرج یونیورسٹیوں کا معائنہ کیا اور ہندوستان واپس آکر علی گڑھ میں ایک مسلم یونیورسٹی کھولنے کی ہم شدت کی جس میں جدید علوم و فنون کی تدیس کا انتظام کیا۔ چنانچہ ان کی شب و روز کی محنت اور پرخوش جذبہ کے باعث علی گڑھ میں انجیلو محمدی کالج کی بنیاد رکھی گئی جس نے آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طور پر وسعت پائی اور مسلمان قوم کے لئے گرانقدر خدمات کا باعث بنی۔

سر سید کے بعد سیاسی میدان میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، نواب تھانوی، نواب مسن الملک وغیرہ اور ادبی میدان میں مولانا حالی، مولانا شبلی اور دیگر ادباء و شعرا آئے جنہوں نے مسلمان قوم کو ہستی کی اتحاد گہرائیوں سے نکال کر ان کے مناسب مقام تک پہنچایا اور پھر سے انھیں ایک باعزت اور باوقار قوم کی حیثیت بخشنے کی سعی کی۔ علامہ اقبال کا دردِ مسعود اس دور میں مسلمان قوم کے لئے رحمتِ آسمانی سے کم

نہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا مسلمان اپنی گزشتہ عظمت کو کھو کر ایک تو اتنے حرمیں نصیب اور
 مایوس ہو چکے تھے کہ دنیا اور مافیہا کو اپنے اوپر حرام سمجھے ہوئے تھے۔ انگریزوں سے
 شکست کھانے کے بعد وہ یہ فرض کر چکے تھے کہ اب اُن سے تکرینِ جٹ ہے اور شاید
 اب سات سو یا ہزار سال تک ان کی غلامی کا دور شروع ہے۔ ملامہ اقبال نے اپنی
 معرکہ الآراء تصانیف سے مسلمان قوم کے دل میں ایک طوفان پیدا کر دیا۔ وہ اپنی
 صلاحیتوں کو مکمل طور پر کھو چکے تھے اور فرض کئے ہوئے تھے کہ اُن کے لئے کوشش کرنا
 اور مجد و جہد کا راستہ اختیار کرنا ہی فضول ہے۔ ملامہ اقبال نے انہیں روشنی دکھاتے
 ہوئے قسطنطنیہ کی مروج و زوال ہر قوم پر آتا ہے۔ اگر وہ اس وقت زوال کے مرحلے میں
 ہیں تو اس سے انتہائی طور پر پست ہمت ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ دور بھی ہر قوم پر
 آیا ہے ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس مرحلے پر ہم اپنے ہوش و حواس کھو نہ بیٹھیں
 بلکہ ہمت سے کام لیتے ہوئے اور اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لاتے ہوئے
 اس زوال کے دور کو کم از کم مرحلے تک محدود کر دیں اور راستے کی مشکلات کو عبور
 کرتے ہوئے ترقی کی منازل طے کرتے چلے جائیں۔ خوش قسمتی سے اسی دور میں قائدِ اعظم
 محمد علی جناح جیسی عظیم سیاسی شخصیت بھی مل گئی جس کی بے مثال رہبری و رہنمائی
 نے مسلمان قوم کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو انتہائی مضبوطی سے سارا دیا اور بالآخر ہم بحیثیت
 ایک قوم کے قیامت خیز طوفان سے بچ سکے اور انگریز اور ہندو کے استبدادی پنجے
 کو چھڑاتے ہوئے اپنا ایک علیحدہ وطن قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جو پورے طور
 پر اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور جہاں ہم آزادی کے سانس لے کر اسلامی تہذیب
 ثقافت اور مذہب کی ترقی کے لئے کوشاں ہو سکے ہیں۔

علامہ اقبال جن کا پورا نام شیخ محمد اقبال تھا اور اقبال تخلص کرتے تھے۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد کشمیر کے ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو تقریباً دو سو سال قبل مشرق بہ اسلام ہوا تھا اور پنجاب میں بکرا آباد ہوا تھا۔ علامہ اقبال کی زندگی میں پنڈت نرو ایک مرتبہ لاہور آئے تو انہوں نے خاص طور پر علامہ اقبال سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور وہ بہت دیر تک کشمیری شخصیتوں کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ اس سے ان دونوں کا کشمیر سے گہرا رگڑ بوج کشمیری نسل جوتے کے ظاہر ہوتا ہے لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ علامہ اقبال کسی طرح علاقائیت کے قائل تھے۔ اپنے بزرگوں کے اصلی وطن کے بارے میں مناسب دلچسپی تو ہر شخص کے لئے فطری امر ہے۔ اس سے علامہ اقبال بھی مبرا نہ ہوں گے لیکن جہاں تک ان کی تعلیمات کا تعلق ہے وہ نہ صرف علاقائیت پسند نہ تھے بلکہ فیضانِ مہم کے بھی خلاف تھے اور پان اسلامزم پر مبنی ملتِ اسلامیہ کے اداس سے بھی اور آفاقیت کے قائل تھے۔ جیسا کہ اس کتاب میں شامل متعلقہ مقالات میں و مباحث کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔

مکتب کی ابتدائی تعلیم کے بعد اقبال سکالر مشن ہائی اسکول سیالکوٹ میں داخل ہوئے جہاں مولوی میر حسن جیسا بھٹے زانہ عربی و فارسی کا عالم انہیں مل گیا۔ ان کے والد شیخ نور محمد خود بھی ایک دیندار بزرگ تھے اور عربی و فارسی علوم اور مذہبیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے جس کا ذکر علامہ نے خود اپنے کلام میں بھی کئی جگہ کیا ہے ان کی ذات کا اثر بھی علامہ اقبال پر ظاہر ہے کہ بہت واضح طریقے پر ہوتا تھا۔ پھر ابتدائی مکتب کی تعلیم سے ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی مذہبی تعلیم سے انہیں بھرپور طریقے پر

فیض پہنچا۔ پھر جب انگریزی تعلیم کے لئے سکول مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے تب بھی خوش قسمتی سے مولوی میر حسن جیسا جتھر عالم انھیں ملیا گیا۔ گویا انگریزی اور دیگر علوم کے ساتھ ساتھ عربی فارسی اور مذہبیات سے انھیں بچیں ہی سے گہرا ربط رہا۔ انگریزی دؤر کے بعض پڑھے لکھے حضرات تو اس قبیل کے تھے کہ اس بات پر فخر کرتے کہ وہ تو صرف انگریزی پر ہی عبور رکھتے ہیں اور اردو تحریر بلکہ بول چال سے بھی تقریباً نا بلند ہیں۔ اور یہ امر یقین جانئے کہ ان کے لئے کسبِ شان نہ تھا بلکہ اسے اپنی خاص بڑائی کے طور پر بتایا کرتے تھے کہ وہ تو اردو تحریر سے نا بلند ہیں۔ انگریزی دور کو تو کیا یاد کرنا آجکل بھی انگریزی سکولوں کے پڑھے ہوئے بعض نوجوان ایسے موجود ہیں جو اردو سے ناواقفیت کو اپنی شان بتاتے ہیں۔ انگریزی علم و ادب اور جدید علوم و فنون پر مہارت تو خیر ایک فخر کی بات ہوئی اور اس سلسلے میں کمال حاصل کر کے فخر کر لینا کوئی بری بات نہیں لیکن اگر فخر اس بات پر کیا جائے کہ وہ اردو سے ناواقف ہیں تو یہ کتنی شرمناک سی بات ہے اپنے ہی ملک اور اس کی زبان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا کہاں کی عقلندی اور بڑائی ہوئی۔ بعض وجوہ کی وجہ سے اگر آدمی اردو زبان سے نا بلند بھی رہ جائے تو اس کی جائز وجہ بیان کر کے معذرت کی جا سکتی ہے لیکن اگر فخر یہ بات کہی جائے کہ وہ تو اردو جیسی ویسی قسم کی زبان سے نا بلند ہیں تو اسے کیا کہا جائے؟ شاید اس طرح یہ عالی نسب لوگ اپنے یورپی اہل ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں یا کچھ اور 'واللہ اعلم بالصواب'۔ ایک مرتبہ قائد اعظم کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے تقریر کا آغاز اردو سے کیا وہ زیادہ عرصہ جنوبی ہند اور انگلستان میں رہنے کی وجہ سے اردو کے ایسے ماہر نہ تھے لیکن بہر حال انھوں نے اپنے طور پر بری سلی اردو میں تقریر کرنے میں انھوں نے بالکل مار نہ سمجھا۔ پھر کچھ دیر بعد انھوں نے کہا کہ

میں دیکھ رہا ہوں کہ غیر ملکی اخبار نویس کافی نقد اور میں یہاں رپورٹنگ *REPORTING* کے لئے موجود ہیں چونکہ وہ اردو نہیں سمجھ رہے ہونگے لہذا ان کے استفادہ کے لئے میں اب انگریزی میں تقریر کروں گا۔ یعنی کس خوبصورت طریقے سے انھوں نے انگریزی میں تقریر کرنے کا جواز پیش کیا جس سے قومی عزت و ناموس کو ذرا بھی ٹھیس نہ پہنچی۔ پھر پاکستان بننے کے کافی عرصے بعد ایک اونچے قسم کے لیڈر کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا تو اچھی پہلی اردو میں فرمانے لگے "چونکہ میری اردو ایسی درست نہیں لہذا میں انگریزی میں تقریر کروں گا" گویا انگریزی ان کی مادری زبان تھی۔ پھر جوائنٹ سنٹ انگریزی کی ٹانگ انھوں نے توڑی ہے کہ اسد توبہ۔ کاش یہ غلامانہ ذہنیت بہت جلد ہی قوم کے دل و دماغ سے نکل جائے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے علامہ اقبال اس قسم کی ذہنیت کے بالکل برعکس نہ صرف انگریزی علوم مثلاً فلسفہ، ہیرسٹری اور اقتصادیات وغیرہ کے ماہر تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اردو فارسی اور عربی میں بھی انھوں نے مہارت حاصل کی اور شعر میں اپنے زمین خیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی اردو فارسی ہی کو بنایا۔ انگریزی میں ان کے کچھ نمونے

RECONSTRUCTION OF ISLAMIC THOUGHT IN ISLAM

میں اتنی ہی معرکہ آرا تصنیف ہے جتنی کہ ان کی اردو فارسی نظم کی تصانیف۔ اور ہم سمجھتے ہیں ان کے خیالات کا کیسی جائزہ لینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی مندرجہ بالا دو قسم کی تصانیف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ انہیں اقتصادیات سے بھی بہت دلچسپی تھی اور ان کی سب سے پہلی کتاب الاقتصاد کے نام سے ہی پیش کی گئی۔

ایف اے کا امتحان اسکاچ مشن کالج بیکلوٹ سے پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج

لاہور میں داخل ہوئے اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے کیا۔ گورنمنٹ کالج میں انھیں پروفیسر آرنلڈ کی شاگردی کا فخر نصیب ہوا جن کی صحبت میں ان کا فلسفیانہ کردار بنا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ اور نیل کالج لاہور میں فلسفہ اور تاریخ کے اور کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے پروفیسر رہے۔ علامہ اقبال ۱۸۹۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گئے۔ مٹرنٹی کالج کیمبرج سے فلسفہ و اخلاق کی ڈگری لی اور پھر میونخ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یورپ کے قیام کے دوران انھوں نے برسرِ شری کا امتحان بھی پاس کیا۔ کچھ عرصہ عارضی طور پر وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۸۹۸ء میں وطن واپس آئے۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے اور پھر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن وکالت کی طرف ان کی توجہ بڑے نام تھی۔ ان کا اصل میدان 'بلکہ اسے خود علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "جنون" کہہ لیجئے، ان کی اخلاقی اور اصلاحی شاعری تھا۔ جس کے فیصل انھوں نے لب اسلامید کے احیاء کی سعی کی۔ ان کی مختلف تصانیف سے متعلق متعدد مقالات اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس لئے اس جگہ ان کا الگ الگ ذکر ضروری نہیں صرف اتنا کہ دنیا کافی بڑا گاکہ اگر ہم اقبال جیسی عظیم شخصیت سے محروم ہوتے تو شاید اس برصغیر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ ابھی صدیوں دور ہوتی ہے

میں غلبتِ شب میں لے کے نکلے گا اپنے در ماندہ کاروں کو

سُورِ فشاں ہوگی آہ میری، نفسِ مرا شعلہٴ بار ہوگا

علامہ اقبالؒ کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ ۱۹۲۲ء میں پنجاب کی مجلس قانون ساز

کے ممبر منتخب ہوئے۔ سن ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے الہ آباد کے اجلاس میں اپنا وہ تاریخی خطبہ پڑھا جس میں ہندوستان کی مشکلات کا حل پاکستان کی صورت میں پیش کیا گیا۔ سن ۱۹۳۷ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ گویا علامہ نے بھارتی زندگی بسر کی جس کے دوران انھوں نے ہر ممکن پہلو سے ملت اسلامیہ کے استحکام اور نشاۃ ثانیہ کی سب سے پہلی کڑی۔ آخر ۱۲ اپریل ۱۹۴۷ء کو حکیم الامت اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے آخری ایام کا یہ نقطہ غیر فانی اہمیت کا حامل ہے۔

سرد و رفتہ باز آید کہ ناید

نیچے از حجب ز آید کہ ناید

مرا آمد روزگار ایں تقسیم

وگر دانائے راز آید کہ ناید

ابتدائی اردو کلام

اسلامیاء ہند کو خواب خرگوش سے بیدار کرنے میں علامہ اقبالؒ کا جو حصہ ہو سکتا ہے اُس کی ایک جھلک اُن کی ابتدائی تصنیف بانگ درا کے مطالعے سے ہمیں سامانہ طور پر مل جاتی ہے۔ نظموں اور غزلوں کا یہ مجموعہ اگرچہ اقبالؒ کے ابتدائی کلام پر مشتمل ہے لیکن اُن کا حیرتی شعور، قومی جذبہ اور مذہبی غماز جس سحر پور طریقے سے اُن کی نظموں میں نمایاں ہوا ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبالؒ اُن عظیم شخصیتوں میں سے تھے جو کسی خوابیدہ قوم کی تقدیر یکسر بدل کر اُن کے دن سنوارنے کے موجب بنے ہیں۔ اُن کی کوئی نظم میں لے لیجئے وہ بے مقصد نہ ہوگی۔ اس میں ایک گرا سبق اور ایک ادنیٰ فلسفہ مفسر ہوگا جو قوم کے بیمار ذہن کے لئے اکیسر کی صورت دکھتا ہوگا۔

اُن دنوں کا قومی ذہن جن موذی بیماریوں میں مبتلا تھا۔ اُن میں اسلام کی اصلی روح کو چھوڑ دینا اور ملٹا کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا۔ جدید سلسلے سے گریز، اعتقادات و

فرقہ بندیوں کی بھرمار۔ خودی اور قومی خودداری کی بجائے ظاہری شپ ٹاپ اور لاف زنی پر بھروسہ اور وطنیت اور علاقائیت کے زہر کی دور رس تاثیر تھی۔ علامہ اقبالؒ نے ان سب امراض کی ایک ماہر نباض کی طرح صحیح تشخیص کی اور صحیح معنوں میں حکیم الامت ہی کو ایک ماہر جراح کی طرح قوم کے مردہ جسم میں زندگی کی روح پھونکنے کی سعی کی۔ انھوں نے اپنے عمل کے لئے شاعری کے نسخے کو آزمایا۔ یوں کہنے کے انھوں نے شاعری میں ایک نیا تجربہ کیا۔ پرانی ڈگر کو چھوڑ کر اس سے بہت بلند مقاصد حاصل کرنے کی سعی کی۔ حسن و حسن کی معاملہ بندیوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک بیہوش قوم کو ہوشمند بنانے کا کام اپنی شاعری سے حاصل کرنے کے لئے کر سکتے ہوئے۔ اب تک تو کم و بیش میں منہمک رہا جاتا رہا تھا کہ شاعری نام ہی محبوب کے ذکر بلکہ اس سے ہم کلام ہونے اور راگ رنگ کی مصلوں اور شراب و غیرہ کے خمار سے سرشار ہونے کا دوسرا نام ہے۔ سرشاری اور سرستی تو اقبالؒ کے کلام میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہ سرستی و سرشاری سطحی تفریح اور ظاہری محسوس پرستی سے متعلق نہیں بلکہ قلبی اسلامیہ کی بگڑی ہوئی قسمت سنوانے سے ہے۔ انھوں نے قوم و ملت کو کھری کھری سناتے ہوئے انھیں یاد دہرایا ہے کہ اگر وہ خواب خرگوش سے بیدار ہو کر اپنی پرانی غفلتوں کو پالنے کے لئے دن رات جہاد میں مصروف نہیں رہیں گے۔ تو ان کا نام و نشان بھی بس صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔

بعض لوگ تو اب بھی شاعری اور ادب کو محض تفریح کا ہی ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور ان سے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کو شعریت یا ادبیت کے پہلو سے الگ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ آجکل جو شخص بے مقصد ادب یا ادب برائے ادب کی رٹ الاپے جاتا ہے اور ادب برائے زندگی میں پنہاں حکیم فلسفے کو سچا پتے سے انکار

کرتا ہے اُس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ وہ بیوقوفوں کی جنت میں رہ رہا ہے۔ وہ درحاضر میں جہاں ہر قوم و معاشرے نے چاہے وہ مشرق کی ہو یا مغرب کی اسلامی ہو یا غیر اسلامی اس اہم راز کو پہچان لیا ہے کہ ملکی و قومی تعمیر و ترقی کے لئے ہر وسیلہ جس کا ایک اہم جزو شاعری اور ادب بھی ہے، بروئے کار لایا جانا چاہئے۔ اگر کوئی قوم اس پہلو کو نظر انداز کرے گی تو وہ لامحالہ باقی ترقی یافتہ قوموں سے بہت پیچھے رہ جائے گی۔ پرانے زمانے میں جبکہ یہ اہم نظریہ ابھی اتنا مقبول نہ ہوا تھا اور بیشتر اقوام میں شاعری و ادب صرف تفریحی طبع کا ذریعہ ہی تھے وہاں اگر کوئی قوم اس نظریے کو اپنانے سے گریز کرتی تھی تو متاثرہ اس سے اتنا زیادہ فرق نہ پڑتا تھا چونکہ باقی بھی اس حتم میں نکلے تھے لیکن اب جبکہ دنیا کی زیادہ تر اقوام بیدار ہیں اور شاعری و ادب کو مکمل طور پر ملکی تعمیر کے لئے بروئے کار لانے میں کوشاں ہیں وہاں اگر ہم اس میدان میں پیچھے رہ گئے تو دوسروں سے مقابلہ کرنا تو درکنار مرگِ مناجات سے دوچار ہونا ہماری تقدیر ہوگی اور ہماری انفرادیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔

ہمارے عزیز ملک آقاؤں اور اُن کی دیگر بجائی بنداستعماری طاقتوں نے ہمیشہ اس نظریے کو طیار میٹ کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کی تاکہ کمزور اور محکوم اقوام اپنی قسمت پر شک کر رہیں اور شمشیر و سناں کو چھوڑ کر طاؤس و رباب ہی کے گرد یہ رہیں۔ چنانچہ انھوں نے شعراء و ادب کو ایک خواب آور نقشہ پرورد اور دومانِ ایلیر مشغلہ ہونے پر ہی زور دیا۔ اس سلسلے میں اقبالؒ کے مقابلے میں ٹیگورؒ کو ذیل پرانہ دئے جانے کے اقدام سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کس قسم کے بے مقصد ادب کی حوصلہ افزائی کے قائل تھے۔ ٹیگورؒ کے رومانوں اور علاقائی ادب نے بنگالیوں پر انھوں کا سا اثر کیا ہے اور

اگر اقبالؒ کی شاعری کی مجاہدانہ روح پر حیثیت مجموعی قوم پر جاری و ساری نہ ہوتی تو کوئی محب بات نہ مٹتی کہ اس وقت اسلامیہ کاشیرازہ مکمل طور پر کچھ جاتا اور اس کا سہرا بجا طور پر عجیب ایسے لیڈروں کے علاوہ نیگیٹر کے متذکرہ فلسفے پر ہوتا جو ایک دوسری نسل سوسائٹی کا آئینہ دار ہے اور جسے ہمارے سابق استعماری مالکوں نے یا دہش بخیر فیل پرائز کے انعام سے نوازا ہے۔

مبادا علامہ اقبالؒ کے درج بالا اور دیگر خیالاتِ زمینی بغیر مناسب دھموزوں مثالوں کے رہ جائیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام سے چند ایک اہم قہقہاتِ کارئینِ کرام کے ملاحظہ کے لئے پیش کر دیئے جائیں۔ معاشرے میں شاعر کے رول ۱۹۱۱ء سے متعلق آپ اُسے یعنی شاعر کو ”جوئے سرودِ آفریقہ سے قبشہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں“ شاعر رول نواز بھی بات اگر کسے کھری

ہوتی ہے اس کے فیض سے مزربا زندگی پڑی

شاہِ نعلیل ہوتی ہے اُس کے کلام سے علیل

کرتی ہے اُس کی قوم جب اپنا شعار آفری

اہلِ زمیں کو سنسنہ زندہ کی دوام ہے

خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

گلشنِ دہر میں اگر جوئے سئے سخن نہ ہو

پھول نہ ہو، گل نہ ہو، سبز نہ ہو، چمن نہ ہو

متحرک زندگی اور خاموش کام ایسے اہم انسانی خصائل ہیں کہ اگر انھیں قومِ خدائے کے طور پر اپنالیا جائے تو ہم ترقی کی منازلِ برقِ فداہی سے طے کرتے ہوئے اپنی گزشتہ

اسلامی عظمتوں کو دوبارہ پالینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستانی قوم ایک سست الوجود جماعت کے طور پر مشہور تھی۔ انگریزوں کی غلامی نے ہمیں مکمل طور پر غلامانہ ذہن بخش دیا تھا۔ اپنا کام خود اپنے ہاتھوں سے نہ کرنا۔ آرام طلبی کو ہمیشہ شایانِ قربانی گردانتا اور خاموش کام کی جگہ لاف زنی اور ظاہر داری میں طغیانی و امتیاز حاصل کرنا ہمارا خاصہ بن چکا تھا، پھر انگریز قوم کو ہم اُستاد کیوں نہ گردانیں کہ جو خصوصیات اور معیارات انھوں نے اپنے آزا اور مائل بہ ترقی معاشرے کے لئے ضروری سمجھا تھا اس کے بالکل برعکس وہ ہماری قوم کے لئے تجویز فرماتے تھے تاکہ ہم خواب خرگوش میں غرق رہیں اور سست الوجودی اور لاف زنی ہی کو ہمیشہ شایانِ بلندی سمجھیں۔ قارئین آگاہ ہوں گے کہ خود انگریز قوم خود کس قدر RESERVE یعنی خاموش ہے جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ مکمل طور پر برونے کا رلا یا ہوا ہے۔ بسوں یا ٹرینوں میں بھی کوئی شخص غیر ضروری طور پر کسی سے بات نہ کرے گا بلکہ سب لوگ انتہائی خاموشی سے اپنے اپنے مفید مطالعہ میں مصروف ہوں گے۔ اسی طرح زندگی کے باقی اوقات میں بھی وہ اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ APPOINTMENT کے بغیر کسی شخص سے ملاجی ممکن نہیں ہوتا اور مصروفیت بھی ایسی کہ اُس پر وقت کے مباح کا احتمال تک ممکن نہیں۔ اس کے برعکس انھوں نے جن خصوصیات کی ہماری قوم میں حوصلہ افزائی کی وہ جھوٹی شان یعنی اپنا کام اپنے ہاتھوں سے نہ کرنا۔ RESERVE یعنی خاموش کارکن ہونے کی بجائے BRIGHTNESS یعنی ظاہر داری پر زور دینا۔ خاموش کارکنوں کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی گئی چونکہ انھیں معلوم تھا کہ اگر خاموش کارکنوں کو آگے لایا گیا تو وہ بہت جلد انگریزی استعمار کا بد یا بستر گول کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر ہم خلفائے راشدین اور اسلامی دور کے دیگر بلند

دستوں کو دیکھیں یا کسی بھی قوم کے زہریں مددگوں تو یہی اوصاف جن کے باعث انگریزوں نے
ترقی کی اور جن کا اد پر ذکر کیا گیا ہے اُن کی ترقی کا محرک بن گئے۔ پہنچ تو یہ ہے کہ محنت،
دیانت، عقل و شعور کا پوری طرح استعمال، لاف زنی کی بجائے کام پر زور، جھوٹ،
چوری، چکاری اور دیگر دنیاوی آلائشوں سے پرہیز کے باعث اگر یہ کہا جائے کہ آج کل
کی ترقی یافتہ قوموں نے اسلام کی روح کو اپنالیا ہے اور اسلامی اقوام صرف اسلام کے نام
کو لے کر بیٹھ رہی ہیں تو حیرانہ ہو گا۔ انہی اوصاف سے متعلق علامہ اقبالؒ کے چند اقتباسات
ملاحظہ فرمائیے۔ متحرک زندگی یعنی جد مسلسل کے متعلق فرماتے ہیں ۷

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے در و سند کا طرب کلام اور ہے
طاؤزِ زبیرِ دام کے نالے تو شن بچے ہو تم
یہ بھی سُنو کہ نالا طائرِ بام اور ہے
آئی تھی کرد سے سدا رازِ حیات ہے سکون
کنتامت سورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے
موت ہے بیشِ جاوداں ذوقِ طلبِ گزند ہر
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے
شیخِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کہہ نمود میں شد و دوام اور ہے

خاموش کاری کی تعریف میں فرماتے ہیں ۸

کیسی پتے کی بات بگوند نے کل کی
سوز ہے ذوالفقارِ دلِ غاں کا کیا غموش

ہنگو مر آفریں نہیں اس کا غم ناز مانند برق تیز، مثال ہوا غموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موثر پہ منہر ہے جادۂ حیات میں ہر تیز ہوا غموش
ہے پاسکتہ شیدۂ فریاد سے جس ننگت کا کارواں ہے مثالِ مبالغہ
مینا دماں شورشِ قفل سے پاہ گل لیکن مزاجِ جامِ خرام آشنا غموش
شاعر کے لشکر کو پر پروازِ حنائی
سرمایہ دارِ گرمیِ آوازِ حنائی

ٹیگور نے رومانیت کے علاوہ علاقائیت پر زور دیا۔ علامہ اقبال نے وطنیت یا علاقائیت سے مادہ ملتِ اسلامیہ کا تصور پیش کیا۔ اور اسلامیانِ ہند کی سیاسی اور اقتصادی آزادی کے لئے علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کی تجویز پیش کی۔ شروع میں اُسے شاعر کا خواب کہا گیا جو بالآخر ایک زندہ حقیقت بن گئی۔ آپ نے رومانیت کے ذہنی آشفاتے کی بجائے ایک متحرک زندگی اور باقتصاد کا سبق پڑھایا۔ انگریزوں کے لئے ٹیگور کی رومانیت اور علاقائیت سود مند تھی لہذا اُسے ذہل پرانے سے نوازا گیا۔ اقبال کا جانا فلسفہ ایک خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کے لئے زبردست طاقت تھا اور فلسفہ کے احیاء کی جبر و پستی۔ لہذا انگریز کو یہ ایک آنکھ نہ بھایا اور انھیں ذہل پرانے سے محروم رکھا گیا لیکن وہ ان استعماری اعزازات سے بے نیاز اپنی جدید سلسل میں بہترین مصروف رہے اور بالآخر ان کی قوم سرخرو ہوئی۔ ٹیگور کا فلسفہ چونکہ رو بہ زوال ہوسٹائی کا منظر تھا لہذا پھر فلسفہ میں عجیب الرحمن کے روپ میں مکمل طور پر ذلیل اور مایوس ہو۔ اقبال کی نظم ”وطنیت“ اسی سیاق و سباق میں ملاحظہ فرمائیے۔

اس دور میں سے اور ہے جام اور ہے جم لو ساقی نے رنایا کی روکشیں لطف و ستم دور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور مذهب کے آذر نے ترشوائے منہم اور

ای تازہ خداؤں میں بڑا سب وطن ہے

جو چہرہ بن اس کا ہے وہ مذہب کا گنہ ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ مذهب نوی ہے غارت گر کاشاؤ دینِ نبوی ہے

بازو ترا تو سید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفیٰ ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیہ مستاسی تو نتیجہ ہے تباہی وہ بھر میں آزاد وطن صورتِ ماہی

ہے ترک وطن سنتِ محبوبِ الہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

جہاں علامہ اقبالؒ نے قلمِ اسلامیہ کی شعلت کے گیت گائے ہیں اور حرب

ہندوستان، چین، ترکی، مصر اور بربر کی شمالی افریقی اسلامی سلطنتوں کی گذشتہ

سلطوت اور درخشندہ ماضی کی تفصیل بیان کی ہے وہاں انہوں نے مسلم اقوام کی پہچان کی

تقدیر پرستی، ملائیت اور تفرقہ بازی پر انہیں طعن و تشنیع کا ہدف بھی بنایا ہے انہیں

خوابِ خرگوش سے بیدار کرنے کے لئے ان کی کمزوریاں اور نالائقیات واضح طور پر ان

کے گوش گزار کر دی ہیں۔ ایک انتہائی بگڑے ہوئے شاگرد کی اصلاحِ احوال کے لئے

جس طرح ایک محنت گیر استاد بالآخر اس کی گوشمالی پر اُتر آتا ہے اسی طرح علامہ اقبالؒ

نے اس بگڑی ہوئی قلمت کی گوشمالی اس طرح کی ہے کہ یہ اُسے صدیوں تک یاد رکھ سکے

اور اُس کے لئے کافی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں قیامِ پاکستان کے لئے جہاں قائدِ اعظم اور دیگر زعماء کا تدبیر اور سیاسی شعور رنگ لایا وہاں علامہ اقبال کی مذکورہ گوشمالی کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ اُن کی شرعاً آفاق نظم شکوہ اور جواب شکوہ میں اُن کا یہ رنگ اپنے عروج پر ہے۔ شکوہ میں اُنھوں نے آج کل کے مسلمانوں کے اُس نقطہ استدلال کو پیش کیا ہے جس کا سہارا لے کر وہ اللہ سے خاتمِ بدہن شکوہ کرتے ہیں کہ کیوں اُن پر اب الطاف و کرام کی بارش نہیں رہی ہے

امتیئیں اور بھی ہیں اُن میں گنگار بھی ہیں مہر والے بھی ہیں مٹے چنار بھی ہیں
ان میں کابل بھی ہیں غفل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں سیکڑوں ہیں کرتے نام سے ہزار بھی ہیں

رمتیں ہیں تری اختیار کے کاشتائوں پر

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اللہ کی طرف سے جوابِ شکوہ اقبال کی زبانی ملاحظہ فرمائیے

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے ہم سے کب پایا ہے ہاں نیند تیں پاری ہے
طبع آزاد پر قیدِ برسنالِ بھاری ہے تمہیں کہہ دو میں آئینِ وفاداری ہے

قومِ مذہب سے ہے مذہبِ جو نہیں تم بھی نہیں

مذہبِ باہم جو نہیں مضیلِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فنِ تم ہو نہیں جس قوم کو پردائے ششمنِ تم ہو
بھلیاں جن میں ہوں آلودہ وہ خرمِ تم ہو بچی کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفنِ تم ہو

ہو بکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے

کیا نہ چور ہے جو مل جائیں منہ پتھر کے

ضعف ایک ہے اس قوم کی فتنان بھی ایک ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
 حرم پاک بھی 'اللہ بھی قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
 فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
 کیا زمانے میں پنپنے کی سی باتیں ہیں!

بانگ درا میں جرقے میں شامل ہیں اُن میں مناظرِ نظرت کی تصویر کشی اور بچوں کے لئے
 نظموں کی بھی ایک خاصی تعداد شامل ہے۔ ان نظموں کی ایک واضح خصوصیت جو ہمارے
 سامنے آتی ہے یہ ہے کہ جہاں آپ نے تفصیل سے اپنے موضوع کا جائزہ لیا ہے اور
 اس کے بیان میں انتہائی لطیف اور شاعرانہ ترکیبیں استعمال کی ہیں اُس کے ساتھ ساتھ
 دو جگہ جگہ بنی نوع انسان کی فلاح اور ملتِ اسلامیہ کی بیداری کی سعی میں انتہائی خیالات اور
 نفسیاتی مسائل حل کر گئے ہیں۔ یعنی اس میدان میں طبع آزمائی کے وقت بھی انسانی مسدوح کا
 پہلو اُن کے دل و دماغ سے وہ نہیں ہوتا اور وہ اس غریبی اور محنت سے اپنا تہ عاید بیان
 کر جاتے ہیں کہ بڑھنے والا طبیعت پر وجہ محسوس نہیں کر پاتا اور اصلاحِ احوال کا پہلو
 بھی اچھی طرح اس کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ بچوں کے لئے نظموں میں زبانِ انتہائی
 سادہ اور عام فہم ہے کہ ان کے لئے اس میں تفریح اور سبق آموزی کا سامان مکمل طور پر
 موجود رہتا ہے۔ اُن کی ایسی نظمیں بچوں کے سلیقے میں زبانِ زورِ عام ہیں۔ مثلاً اُن کی
 نظم بچے کی دعا جس کا پہلا بند ہے ۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے منت میری زندگی شمع کی صورت ہو خدا یا میری
 دور دنیا کا مرت دم سے اندھیل ہو جائے ہر جگہ میرے چکنے سے اُجالا ہو جائے
 ہر دم سے یونسی میرے وطن کی زینت

جس طرح پہلو سے ہوتی ہے چھٹی کی زینت
اسی طرح اُن کی نظم ہمدردی تجتے تجتے کی زبان پر ہے اور اس میں کس خوبصورت انداز اور
سادہ زبان میں کس قدر ارفع و اعلیٰ پیغام دیا گیا ہے ۔

شہنشاہ پہ کسی شجر کی تنہا	بہل ستا کوئی اُداس بیٹا۔
کوتا ستا کو رات سرد پہ آئی	اڑنے بچنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیانہ تک	ہر پسینہ پہ چپ گیا اندھیرا
سہل کر مہل کی آہ و زاری	ٹنگٹو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے	کیڑا ہوں اگر چہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری	میں راہ میں دوستی کروں گا
اٹھنے دی ہے مجھ کو شعل	چمکا کے مجھے دیا بسایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

آتے ہیں جو کام دوسروں کے

مناظرِ فطرت کی نقشہ کشی کے سلسلے میں اُن کی کوئی نظم بھی لے لیجئے۔ اُس میں
تفصیل سے اُس منظر کا بیان بھی ہو گا اور اس کے ساتھ ساتھ کسی اور بچے مقصد کی نشان دہی
میں نہایت فلسفیانہ انداز میں اس میں موجود ہوگی۔ ان کی نظم کنوارا دی کا ایک ہندو خط
ذرا لے لیں ۔

رواں ہے سینہ دریا پہ ایک سفینہ تیز

ہوا ہے مری سے طارح جس کا گرم ستیز

شکردی میں ہے مثلِ نگاہ پہ کشتی

دنک کے حلقہٴ حسدِ نظر سے دور گئی
جوازِ زندگی آدمی رواں ہے یرغنی
ابد کے بھر میں پیدا یرغنی نہاں ہے یرغنی
شکت سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن قاتل نہیں ہوتا

نظم امیر کوہسار سے اقتباس کا خط فرمایے ۛ

بے بندی سے فلک بوس نشیمن میرا ابر کسار ہوں گل پوش ہے دامن میرا
کبھی سحر کبھی گلزار ہے مسکن میرا شرد ویرانہ ہوا 'بھر مرا' بھن میرا
کسی دادی میں جو منظور ہو سونا جھوکو
سبزہ کوہ ہے غسل کا بھوننا جھوکو

"بانگ درا" میں اقبالؒ کی غزلیات کا بھی ایک خاص مجموعہ شامل ہے لیکن ان
میں بھی خالص عشقیہ غزلیں بہت کم ہیں۔ ان کی طبیعت غزلوں میں بھی فلسفیانہ خیالات
اور بلند مقاصد کی نشاندہی میں ہی اپنے عروج پر ہے ۛ

ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے ٹھینا تہانہ بھی 'حرم بھی' کلیسا بھی چھوڑے
سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے اسے بے خبر جزا کی قتا بھی چھوڑے
جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیب پر مدار شرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑے

واعظ ثبوت لائے جوئے کے جواز میں

اقبالؒ کو یہ صند ہے کہ چنیا بھی چھوڑے

الغرض اقبالؒ کے مجموعہٴ کلام کا کوئی بھی میدان لے لیجئے چاہے وہ منظرِ فطرت

کی نقشہ کشی ہو یا بچوں کی نظمیں - غزلیات ہوں یا کسی نظریہ فکر پر کوئی طویل نظم - ہم ان کے خیالات ان کی مختصر سی نظم بعنوان شاعر کے مطابق پاتے ہیں ۔

قوم گو یا جسم ہے افراد ہیں اعضاء قوم
شاعر رنگیں نر ہے دیدہ، سینائے قوم
جتنائے درد کوئی عضو پر، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

حکیم مشرق

علامہ اقبالؒ نے اپنا مجموعہ کلام ”پیام مشرق“ گرتے گئے مغربی دیوان کے جواب میں لکھا ہے۔ گرتے گرتے خود انہوں نے ”حکیم حیات“ کے نام سے رسوہ کیا ہے۔ گرتے کی یقینیت ایک گدسہ عقیدہ ہے جو اس نے مغرب کی طرف سے مشرق کو بھی وہ فارسی شعرا اور خاص طور پر حافظ شیرازی سے خصوصیت کے ساتھ متاثر تھا۔ اس زمانے میں مین افسویں صدی کے اوائل میں جرمن قوم کا انحطاط آج کل کی مشرقی اقوام کی طرح اپنی انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ حافظ کی مترجم خیال آرائیوں میں گرتے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ بقول علامہ اقبالؒ ”وہی زمینی مستحوا وہی آسمانی محبت“ وہی سادگی، وہی کٹھن دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی۔ غرض ہر بات میں اسے حافظ کا شیل پاتے ہیں جس طرح حافظ لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے اُسی طرح گرتے بھی ہے دروازہ عام تباہی و بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی سکون و اطمینان کو محفوظ رکھ کر

اپنی قدیم ترقم دینی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔

”پیام مشرق“ کے متعلق جو گونٹے کے ”مغربی دیوان“ سے سو سال بعد لکھا گیا ہے، علامہ اقبالؒ خود فرماتے ہیں کہ اس کا تدار زیادہ تر اُن اخلاقی مذہبی اور ملی حقائق کو پیش کرنا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل زیندگی کے بعد آئندہ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی و بیرونی اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں مشکل نہ ہو۔ نظرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنّ الله لا یغیر ما بقو مرحضاً بغيره بالافسہد کے ساتھ اور بطریق الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر عادی ہے۔ علامہ اقبالؒ ”دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جزا فیانی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اقوام کی طبائع پر خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی“ وہ فرسودہ، سست رنگ اور زندگی سے گریز کرنے والی غلبت غائب نہ آجائے جو جذباتِ قلب کو افکار و بارغ سے متمیز نہیں کر سکتی۔

گوٹے نے فارسی شاعری کی سرن غریت کا اثر قبول کیا ہے، اس کی نگاہ صاف نہیں مشرقی حقائق پر پڑتی ہے جن کو اس کی مغربی نظرت جذب کر سکتی ہے۔ بلکہ سترن سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ گو اسے یہ بات معلوم تھی کہ مشرق میں خواہ جہ حافطہ کے شمار

کی تفسیر تصوف کے نقطہ نگاہ سے کی جاتی ہے۔ وہ خود تغزل محض کا دلدادہ تھا اور کلام سادہ کی صوفیانہ تعبیر سے اُسے کوئی بہرہ دی نہ تھی۔ مولانا روم کے فلسفیانہ حقائق و معارف اُس کے نزدیک مبہم تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے وہی کے کلام پر غائرانہ نگاہ نہیں ڈالی کیونکہ مسئلہ وحدت الوجود کی حمایت میں قلم اٹھانے کے باوجود عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ مدھی کا قائل نہ ہو۔ اپنے اور گروئے کا مقابلہ کرتے ہوئے ملا مر اقبالؒ فرماتے ہیں کہ دونوں ضمیر کائنات کے واقع میں اور موت کے اندر پیغامِ حیات ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ برہنہ خیر کی مانند ہے اور میں ابھیں نیام میں ہوں۔ وہ گروئے کی اس خصوصیت سے کچر شاکی نظر آتے ہیں کہ انھوں نے مشرقی شاعری کے صرف ظاہری معنوں کو اپنایا اور جامد الفاظ میں پوشیدہ جہانِ معنی کے باطنِ خزانوں کو ڈھونڈ نہ پایا۔ وہ صرف مشرقی تغزل ہی سے اثر لے سکا اور مشرق کے تصوف۔ اُس کی بیتیابی، جاس اور اُس کے کمال جنوں (جس میں فرزانگی پنہاں ہے) کو نہ پاسکا۔ اُن کے مندرجہ ذیل اشعار ان خیالات کا مرقعہ پیش کرتے ہیں :-

ہر وہ داناے ضمیر کائنات	ہر وہ پیغامِ حیات اندر مات
ہر وہ خیر صبحِ خند آئینہ نام	اُدو بہتہ من ہنوز اندر نیام
آشنائے من زمین بیگانہ رفت	از خستہ تنم تنی پیما نہ رفت
او حدیثِ دلبری خواہ نہ من	رنگ و آبِ شاعری خواہ نہ من
کم نظر بیتابی حساب نم ندید	آشکارم وید و چسب نم ندید
ظربت من عشق را اور بر گرفت	سورتِ خاشاک و آتش در گرفت
حق در موز ملک دویں بر من کشود	نقشِ غیر از پردہ چشم ر بود

تانا پنداری سخن دیوانگیست
در کمالِ این جنوں فرزندِ انگلیست

(ترجمہ ۱) دونوں ضمیر کائنات کے جاننے والے ہیں۔ دونوں موت کے اندر حیات کا پیغام ہیں۔ دونوں آئینے کی طرح صبح کی مانند چمکتے ہوئے شجر ہیں۔ وہ برہنہ ہے اور میں ابھی نیا م میں ہوں۔ میرا آشنا مجھ سے بیگانہ چلا گیا اور میرے خستہ سے خالی جام ہی چلا گیا۔ وہ مجھ سے دہری کی باتیں چاہتا ہے اور مجھ سے شاعری کا رنگ اور چمک مانگتا ہے۔ اس کم نظر نے میری جان کی میتابی نہ دیکھی اس نے میرا ظاہر دیکھا اور میرا باطن نہ دیکھا۔ میری فطرت نے عشق کو خاک کی صورت پہلو میں لے لیا اور اُسے سلگادیا یعنی راد حق اور راہِ وفا کو اپنا یا اور اُنھیں چمکا کر رکھ دیا۔ حق تعالیٰ نے ملکِ دو دین کے رموز مجھ پر کھولے اور عزیز کا نقش میری آنکھ کے پردے سے ہٹا دیا۔ جب تک کہ تو غور نہ کرے میری باتیں دیوانچی معلوم ہوں گی لیکن جنوں کے اس کمال میں عقلمندی پوشیدہ ہے)

علامہ اقبال "مشرق میں پیدا ہوئے اور اسلامی فضا میں اُنھوں نے آنکھ کھولی اور زندگی بسر کی۔ لازمی طور پر اُنھوں نے اپنے گروہ و پیش کے اہتر حالات کو دیکھ کر ہر ممکن طریقے سے اُن میں بہتری کی صورت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے مغربی تہذیب کی اندھا دُشمن *MATERIALISM* اور انسانی و مذہبی جذبات سے مکمل طور پر معترِ اُپی پر بھی واضح طور پر چٹیں کر کے اُن کے محبوب کو درست کرنے کی سعی کی ہے لیکن اُنھوں نے مشرق اور اسلامی دنیا میں رہتے بے محبوب و مضمرات کو *POSSE* یعنی حیاں کر کے اُنھیں اُور کرنے کی طرف بجا طور پر زیادہ توجہ دی ہے۔ کتاب کے عنوان "پدمِ مشرق"

کے ساتھ ہی بلکہ المشرق والمغرب کے اتحادِ استمال کر کے اُنہوں نے واضح کر دیا ہے کہ مشرق ہو یا مغرب اللہ تعالیٰ ہی کی سز میں ہے اور یہ کہ وہ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب کی کوئی تمیز روا نہیں رکھتا۔ اس طرح اُن کی آفاقیت مکمل طور پر واضح اور عیاں ہے۔ بہر حال چونکہ وہ خود مشرق کی پیداوار تھے، ایک مسلم گھرانے اور مسلم علاقے میں اُنہوں نے جنم لیا اور یہیں کی فضا میں اُنہوں نے زندگی بسر کی لہذا یہ لازمی امر تھا کہ وہ مشرقی اقوام اور اسلامی دنیا کی پسماندگی کی نشاندہی کریں اور پسماندگی کے اس پیاز کو جو ہماری ترقی کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے جبر کر کے کی راہیں نہایت تفصیل سے ہمیں بتائیں اگر وہ ایسا نہ کرتے بلکہ صرف پہلے سے ترقی یافتہ مغرب ہی کی طرف ترجیح مینڈول کئے رکھتے تو یہ ایک غیر فطری بات ہوتی۔ مشرق اور خصوصاً اسلامی دنیا کی آجکل کی انتہائی پسماندگی کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

ابھی در دشتِ خویش اور ادا رفت	از دم او سوزِ اَلَا اللہ رفت
مصر میں اُفتادہ در گردابِ نیل	سُستِ رگ تو رانیانِ ژندہ پیل
آبلِ عثمان در شکنجِ روزگار	مشرق و مغرب ز خویشِ روزگار
مسلم ہندی شکم را بسندہ	خود فروشنے، دل بڑھیں بر کندہ
در مسلمانِ مشاہین مجھوئی نہاند	خالہ و فاروق و اقبولِ نہاند
قلبِ آوارہ کوہ و دمن	در رگِ او خونِ شیراں موج زن

تازہ کنِ آئینِ سدیدِ دمر
چوں مباحِ لالہ صحرَا گزر

(ترجمہ: اہل شرب اپنے ہی صحرا میں راستہ بھول گئے۔ اُس کے سانس سے آقا اللہ کا سوز ختم ہو گیا۔ مصری لوگ گرداب نیل میں گر گئے۔ باقی ایسے مضبوط قرآنی ابستہ رہے جو نہ ہونے دیں۔ آل عثمان زمانے کے ٹکٹے میں پھنسنے ہوئے ہیں۔ مشرق اور مغرب اُس کے خون سے لالہ زار بنا ہوا ہے۔ ہندی مسلم پیٹ کا بند ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے اور اُس نے دین سے اپنے دل کو ہٹا دیا ہے۔ مسلمان میں محبوبی شان نہیں رہی۔ اُس میں خالد فاروق اور ایوب کی صلہ نہیں رہی۔ اُسے کو دوسمن کی آوارہ قوت کہ تیری رگوں میں شیروں کا خون موجزن ہے تو مدینہ کو مدینہ کے آئین کو تازہ کر اور صبا کی طرح لالہ صحرَا پر سے گذر جا)

لخت آوارہ کرد دوسمن یعنی افغانستان کے فرمانروا کو ترقی کا نسخہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جہد و جد اور علم ترقی کا زینہ ہے۔ بد قسمتی سے ہم نے جدید علوم کو یورپ کا سرمایہ سمجھ کر ان سے اجتناب اور فرار کی ماد اختیار کر لی ہے حالانکہ دراصل یورپی اقوام نے یہ علوم پہلی دنیا ہی سے حاصل کئے تھے۔ اسی طرح جہد و جد کو چھوڑ کر انہیں کا نشہ ہم پر حاوی ہو گیا ہے جس سے ہم خواب خرگوش کے مزے لیٹے رہ گئے۔ مگر اقبالؒ نے ہمیں مسلسل جہد و جد کی تلقین کی اور جدید علوم کا کسیر بنا کر انہیں ملنا اور فضیلت کے ذریعے دوبارہ راسل کرنے پر اکسایا۔ اس کے ساتھ افغانستان کو اس امر پر مائل کیا کہ اپنی ملکی دولت کو جو پانڈوں میں پوشیدہ ہے یعنی دھاتوں و دھیرہ کو جن کی کہ افغانستان میں کسی حد نہیں بالکل طور پر دریافت کر کے اُن سے استفادہ کریں تاکہ ملک صحیح معنوں میں ترقی کی جانب گامزن ہو سکا۔

خود ان کے الفاظ میں سنئے

زندگی جہد است و استحقاق نیست جز بعبلم نفس و آفاق نیست

گفت حکمت را خدا خیر کشید ہر کجا این خیر را بینی بگیر
 علم اشیا علم الہما ستے ہم مسا و ہم ید بیغیا ستے
 علم اشیا داو مغرب را فروغ حکمت روماست می بندہ ذروغ
 جان مار الذبت احساس نیست خاک رہ جز ریزہ احساس نیست
 علم و دولت نظم کا ریت است علم و دولت اعتبار ملت است
 آں یکے از سینہ احرار گیر دال و گر از سینہ کمر گیر
 دشمنہ زن دیر پیکر اس کائنات در شکم دار و گھر چوں سونات

لعل ناب اندر بدخشاں تو هست

برق سینا در تہتان تو هست

(ترجمہ : زندگی کو شش سے ہے اور اس کے بغیر اس پر ہمارا حق نہیں یہ سوائے

اس جہاں اور آفاق کے علوم کے اور کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیر کثیر کہا ہے

جہاں بھی تو اس نیکی کو دیکھے پکڑ لے۔ اشیا کا علم جہانوں کو تسخیر کرنے والا علم ہے یہ

عصائے موسیٰ بھی ہے اور ید بیغیاۓ عیسیٰ بھی۔ علم اشیا نے مغرب کو ترقی دی وہ اصل

میں ہماری ہی حکمت ہے اور ہمیں سے اُس کی تعمیر ہوئی۔ علم و دولت قوم کے لئے مختلف

شعبوں کے نظم و نسق کا باعث بنتا ہے۔ علم و دولت قوم کا اعتبار ہے۔ اُس ایک کو

تو مردانِ عمر کے سینے سے لے اور اُس دوسری چیز کو تو پہاڑ کے سینے سے لے۔ اس کائنات

کے پیکر میں تو خنجر ہیست کر۔ یہ پیٹ میں سونات کی طرح لعل و گہر لئے ہوئے ہے۔

تیرے بدخشاں میں لعل ناب ہے اور تیرے پہاڑوں میں برق سینا موجود ہے۔)

علامہ اقبال جتنے ترنہ کو ترقی کا پیش خیر بتایا ہے۔ جب کسی اونچے مقام پر پہنچنے

کی آرزو ہمارے دل میں پیدا ہوگی، جب ترقی کی منازل طے کرنے کی خواہش ہمارے دماغ میں ہوجانے لگیں گے اور جب طاقتور اور دولت مند بننے کی تمنا ہمارے سپلوں میں گردش کرنے لگیں گی تب ہم اس مقام کی طرف اپنا سفر شروع کر سکیں گے۔ جب اونچا اڑنے کی خواہش ہو کہ ہم اپنے آپ میں پروان نہ چڑھا سکیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے کہیں کوشش کا خیال ہی پیدا نہ ہوگا اور اسے حاصل کرنے کا توخیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اپنی اس قصیف میں علامہ اقبالؒ نے جگہ جگہ آرزو متا اور بلند ہمتی کی تلقین کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دریں گلشن پریشان مثل بوبم منی و انم چو می خواہم چہ بجزیم
برآید آرزو یا بر نیاید شہید سوز و سائے آرزویم
(ترجمہ: میں اس گلشن میں خوشبو کی طرح پریشان ہوں میں نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کس کی تلاش میں ہوں۔ میری آرزو برآئے یا نہ برآئے میں آرزو کی سوز و ساز کا شہید ہوں)

خرد گفت ادب چشم اندر نگنجد نگوشت و شوق در امید و بیم است
منی گرد و کمن آفتاب طور کہ در ہر دل قنائے کلیم است
(ترجمہ: عقل نے کہا کہ وہ آنکھ میں نہیں سما سکتی۔ نگاہ و شوق امید و بیم کے عالم میں ہے۔ طور کا آفتاب پُرانا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ہر دل میں حکیم کی تمنا ہے)

تیر و سان و خنجر و شمشیر آرزوست بامن نہا کہ مسلک شہیر آرزوست
از ہر آشیانہ خس اندوزیم بگر بازاں بگر کہ شہد و گریم آرزوست
گفتند لب بہ بند ز اسرار با نگو گفتم کہ خیر! نعرہ تجسیم آرزوست

گفتہ ہرچہ در دولت آید زما بخواد گفتہ کہ بے محابی تقدیرم آزدوست
از روزگار خویش ندانم جز این قدر خوابم زیاد رفته و تعبیرم آزدوست
کو آں نگاہ نماز کہ اول و لم ربود

عمرت دراز باد یہاں تیرم آزدوست

(ترجمہ : مجھے تیر اور سناں اور خنجر اور شمشیر کی آزدوستی ہے۔ تو میرے ساتھ نہ آچو کہ
مجھے شبیر کے مسلک کی آزدوستی ہے۔ تو دیکھ کہ ہم نے اپنے آشیانے کے لئے غصہ کی
اور پھر یہ جس دیکھ کہ آزدوستی ہے کہ ہماری بغل میں شعلہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ اپنے ہونٹ
بند کر لو۔ اور ہمارے اسرار سے متعلق بات نہ کرو۔ میں نے کہا کہ خیر ہے، میری آزدوستی ہے
کہ میں نعرۂ تجسیر بلند کروں۔ انہوں نے کہا کہ جو کچھ تمنا دل چاہے اس کی خواہش کرو۔ میں
نے کہا کہ مجھے تقدیر کی بے محابی کی خواہش ہے۔ میں اپنے زمانے سے متعلق اس کے ہوا
کچھ نہیں جانتا کہ میں نے بہت خراب دیکھے ہیں اور مجھے اس کی تفسیر کی ضرورت ہے۔ وہ
کونسی نگاہ نماز تھی جو سب سے پہلے میرا دل چسپ کر لے گئی۔ تیری عمر دراز ہو مجھے اسی
تیر کی آزدوستی ہے)

جہاں یک نقد ذاب آزدوستی بم و دیریش ز تاب آزدوست

بکشم ہرچہ بہت دہود باشد دے از روزگار آزدوستی

(ترجمہ : یہ دنیا آزدوست کا ایک نقد زار ہے۔ اُس کے اونچے اور نیچے سُر آزدوست
کی تار کے باعث ہیں۔ میری آنکھ میں جو کچھ بھی ہے یا ضایا ہو گا وہ آزدوست کے روزگار
ہی کا ایک لمحہ ہے)

نخار و کار با دہن ہنساں عشق قدر و مردہ را شاہیں نگیرد

(ترجمہ: عشقِ بہت ہمت لوگوں سے کوئی سرکار نہیں رکھتا، شاہین مردہ کبوتر کو قبول نہیں کرتا)

اگر ہمارے دل میں آرزو مندی کی بجائے خیر ہی ہو، اگر ہم بلند سے بلند تر منزل تک پہنچنے کی آرزو رکھتے ہوں۔ اگر ہم بہتر اور اُس سے بھی بہتر کامیابی حاصل کرنے سے مستحق تو ہوں لیکن اس آرزو، اس خواہش اور اس تمنا کی تعمیل کے لئے ہم مسلسل سے کام نہ لیں تو ہماری یہ آرزو، یہ خواہش اور یہ تمنا شیخ چٹکی کے خوابوں کے مترادف ہوگی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی ان خواہشات کی تعمیل کے لئے یکسوئی سے اور باقی ہر خیال سے بیگانہ ہو کر انتھک جدوجہد کے ایک لامتناہی سلسلے میں مصروف ہو جائیں۔ شروعات کی ناکامیوں سے ہرگز بد دل نہ ہوں۔ چونکہ آخر زندگی تو ہے پس نشیب و فراز کا نام۔ اس زندگی میں جہاں کامیابیاں ہمارے قدم چومتی ہیں وہاں ناکامیوں کا سامنا ہونا بھی ضروری اور فطری امر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عظیم فرد اور عظیم قوم وہی ہے جو راستے کی ناکامیوں اور رکاوٹوں سے گھبرا کر جدوجہد کو چھوڑ نہ دے بلکہ اُن ناکامیوں، اُن رکاوٹوں اور راستے کی اُن مشکلات پر قابو ہونے کی ترکیبیں سوچے اور بالآخر اپنی زیر کی اور بلند ہمتی سے اپنے راستے کی بڑی سے بڑی رکاوٹ پر قابو پا کر کامیابی کو اپنے آپ سے ہٹکار کر لے۔ علامہ اقبالؒ نے یہی سبق ہمیں مشابہت و مناسبت سے دیا ہے۔ منہ جھڑیل اشعار میں ان کا پیغام ملاحظہ ہو ۵

سکندؒ ہنصر خوش نکتہ را گفت شریک سوز و ساز نہ بھر و بر شو

تو ایں جنگ از کنا بر مرصہ بین بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

(ترجمہ: سکندرنے خضر سے کیا جمعی ہے کی بات کہی کہ تو بھر اور بھر کے سوز و ساز نہ

کا شریک بن جا۔ تو اس جنگ کو میدانِ کارزار کے کنارے سے دیکھ رہا ہے۔ (جنگ میں شامل ہو کر ختم ہو جا۔ اور اس طرح پہلے سے زیادہ بھرپور زندگی ماحصل کر)۔

بہل افشاں آں پا چرخے حدیثِ سوزِ آوازِ گوش است

من آں پروانہ را پروانہ دارم کہ جانفشِ سختِ گوش و شغلِ فزون است

(ترجمہ: اُس چراغِ پا کا افشاں سُنو۔ اُس کے سوز کی حدیثِ ہمارے کانوں

کی آواز بنی ہوئی ہے۔ میں اُس پروانے کو پروانہ کہتا ہوں جس کی جانِ سختِ گوشش کرنے والی اور شغلِ فزون ہے یعنی میسبتیں برداشت کرنے کی عادی ہے)۔

سحر و شخارہ بوستانے چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری سُرودے، نالہ، آہے، فغانے

(ترجمہ: صبح کے وقت ایک باغ کی شخارہ پر ایک نغمہ خواں پرندے نے کیا

خوب کہا کہ تو اپنے سینہ میں سُرود، نالہ، آہ یا فغان جو کچھ بھی رکھتا ہے اُسے باہر نکال،

میارا بزمِ بر محل کہ آئینا نوائے زندگانی نرم خیز است

جد یا غلط دبا موحش در آویز حیاتِ جاوہرِ اندر ستیز است

(ترجمہ: تو اپنی بزمِ بر محل پر آراستہ مت کر چونکہ وہاں زندگی کی بے نرمی

پیدا کرتی ہے یعنی زندگی کی مشکلات سے نبرد آزما نہ ہوتے ہوئے تو آسانی کی زندگی بھر

ذکر۔ تو دریا میں پھلانگ جا اور اس کی موجوں سے نبرد آزما ہو۔ ہمیشہ کی زندگی بدو جہد

میں پوشیدہ ہے)

دلِ بیباکِ راضی نامِ زندگی است دلِ ترسندہ را آہویک است

اگر جیسے نعداری بھر موحشِ منڈک است اگر ترسی بھر موحشِ منڈک است

(ترجمہ: ایک بیگ دل کے لئے بڑی سے بڑی شکل آسان ہوتی ہے اور ڈپرک
دل کے لئے ہرن بن چیتے کی مانند ہوتا ہے۔ اگر قوخت نہیں دکتا تو بحر جس صحر ہے اور
اگر ڈرتا ہے تو اُس کی ہر موج اژدہا ہے۔)

دل من راز دہان جسم و جان است نہ پنداری اجل برین گران است
چہ علم گر یک جہاں گم شدہ چشم ہنوز اندر ضمیر ممد جان است
(ترجمہ: میرا دل جسم اور جان کا راز دہاں ہے۔ تو یہ نہ سمجھ کہ اجل مجھ پر بھاری
ہے۔ کیا علم اگر ایک جہاں میری آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ ابھی میرے ضمیر میں سیکڑوں
جہاں موجود ہیں۔)

بخوشیوہ و پختہ تدبیر باش حضور دخیور و کلاں گیر باش
نگہ دار خود را و نورسند زنی دلیر و درشت و تنومند زنی
نصیب جہاں آنچہ از خوی است زمسکین و محنت و پردہ می است
چہ خوش گفت فرزند خود را عقاب کہ یک قطرہ خون بہتر از لعل ناب
کنائے نگیریم در باغ و کشت کہ داریم در کوہ و صحرا بہشت
ذوئے زمین و اند چیدی خطاست
کہ چہائے گردوں خدا داد است

(ترجمہ: نیک شیوہ اختیار کر اور تدبیر میں پختگی حاصل کر۔ تو جرات مند، غیور
اور اپنے مقصد رکھنے والا بن۔ تو اپنے اوپر نگہ کر کہ یعنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا
اور جسی خوشی زندہ رہ۔ دلیر اور درشت اور تنومند بن کہ زندہ رہ۔ عقاب نے اپنے
بیٹے سے کیا خوب کہا کہ خون کا ایک قطرہ لعل ناب سے بہتر ہے۔ ہم باغ اور کھیت

میں پیادہ مل نہیں کرتے چونکہ ہم سپاڑ اور صحرا میں ہی اپنی بہشت سمجھتے ہیں زمین پر
سے دانہ چُٹنا غلطی ہے چونکہ آسمان کی دستیں اللہ تعالیٰ نے ہیں عطا کی ہیں) -

ایک دُڑا بے مایہ ستارِ نفسِ اندوخت

شوقِ اس قدر شش سوخت کہ پروا کی آغوش

پہنائے شبِ افروخت

و اماںدہ شعلے کہ گرہِ خور و شر شد

از سوزِ حیات است کہ کارش بہرِ زر شد

دارائے نظر شد

پروا نہ بے تاب کہ ہر سونگ و ٹوکرو

پر شمعِ چُناں سوخت کہ خود را بہرِ او کرد

ترکبِ من و تو کرد

(ترجمہ : ایک بے قیمت دُڑے نے اپنی جان کی دولت جلا دی۔ اُس کے شوق نے

اُسے اس قدر جلایا کہ اُسے پروا نہ سکھا دی۔ اُس نے رات کی دستوں کو روشنی کر دیا۔ ایک

سنگ کی جوتی شعلے میں اُجھن میں تھیں اور شر بن گئی۔ یہ زندگی کے سوز کی ہی وجہ تھی کہ انجام نہ

وہ سونا بن گئی اور صاحبِ نظر بن گئی۔ وہ بے تاب پروا نہ جو ہر طرف نگ و ٹوکنا تھا شمع

پہ اس طرح جلا کہ اُس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اُس میں شامل کر دیا اور تو کے

قے کو ہی ختم کر دیا) -

غزالے پہ غزالے درو دل گفت ازیں پس در حرمِ غیرم کن سے

بھرا صید بنداں در کیس اند بکاسے آہواں مجھے نہ شام سے

امان از مستند میا و خواہم

دے زندیشہ با آزاد خواہم

رفیقش گفت اسے یا بخود مسند اگر خواہی حیات اندر خطر نمی

و مادام خویش را بر فناں زن ز تیغ پاک گوهر تیز تر نمی

خطر آب و توان را امتحان است

عیار ممکنات جسم و جان است

(ترجمہ) ایک بہن نے دوسرے بہن سے دل کا درد کہا کہ اب سے بعد میں حرم

میں پناہ لوں گا۔ صحرا میں شکار کرنے والے کہیں لگائے بیٹھے جتے ہیں۔ ہر فن کی

مرضی کے مطابق توضیح ہوتی ہے اور دشنام۔ میں میاؤں کے قفس سے امان مانگتا ہوں۔

لحم بھر کے لئے میں پریشانیوں سے آزادی چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھی نے کہا کہ اسے

عقلندہ دوست اگر تو زندگی چاہتا ہے تو خطرات کے اندر رہ کر زندہ ہو وقت تو اپنے

آپ کو فناں یعنی تموار کو تیز کرنے والا آلہ بنائے رکھ پڑھا رہا رہ معین اونچے سے اونچا

مستند وصل کرنے کی کوشش میں جدوجہد مسلسل میں مصروف رہ اور صاف دشمنان تموار

سے بھی زیادہ تیز ہو کر رہ۔ خطرات تو آب و تفل یعنی محنت شاقہ اور جدوجہد مسلسل کے لئے

امتحان ہیں اور جسم و جان کی ممکنات کے لئے کسوٹی ہیں)۔

بدقسمتی سے فرنگی نے ہماری قوم میں ایسی عادات و اطوار کی حوصلہ افزائی کی ہے

یا فرنگیوں پر ہی کیا الزام دھرتا بدقسمتی سے اب تک خود ہم میں ایسی صفات کی حوصلہ

افزائی ہوئی ہے جو ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن کر رہ گئی ہیں۔ مثلاً خود انگریز تو

ایک RESERVE یعنی خاموش قوم ہے اور کھوئی سے کسی تعمیری کام میں مشغول

رہنا اس کا خاصہ ہے۔ لیکن ہماری قوم میں کام کم لکین BRIGHTNESS یعنی
 نفاہر داری اور چمکیلے پر نہ زیادہ زور دیا گیا۔ ہمارے ہاں خاموش کارکن کا مذاق اُڑایا
 جانے لگا۔ اصلاح داری میں خصوصی امتیاز حاصل کرنے والے کو اونچا مقام ملے گا۔ نتیجہ
 ظاہر ہے۔ خاموش کام کی طرف توجہ ہوئی نہ ہی ترقی کے میدان میں ہم نے حیرت انگیز
 کاروائی دکھائی۔ صرف ظاہر داری، لباس اور ہرزہ گوئی کے چمکیلے پن ہی میں امتیاز
 حاصل کیا۔ یہی حال آج کل کی جملہ غیر ترقی یافتہ مشرقی اقوام کا ہے۔ خاموش کام کو
 چھوڑ کر ظاہر داری ہمارا خاصہ بن چکی ہے۔ ہم تنوں کے پیچھے بھاگتے ہیں کام کے
 پیچھے نہیں۔ اگر خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہیں تو پانی کی تیز بہتی ہوئی ندی کی
 طرح بن جائیں جو گرد و پیش سے بیگانہ اپنے کام میں محو اس قدر طاقتور بن جاتی ہے
 کہ اپنے راستے میں آئے ہوئے صحرا کو کاٹ دیتی ہے اور پہاڑ کے سینے کو چیر ڈالتی ہے۔
 اُن کی نگرانی سے آب سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

در راہ ادبہار پر کینانہ آفرید نرگس دمیدہ لالہ دمیدہ و سمن دمیدہ
 گل عشوہ داد و گفت یکے پیش ما بایت خندید غنچہ و سہرہ امان او کشید
 نا آشنائے جلوہ فروشان سبز پوش صحرا برید و سینہ کوہ و کمر درید
 زہی بجر بیکرانہ چہ مستانہ میرود

در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود

د ترجمہ: اس کے راستے میں بہار نے پری خانہ پیدا کیا۔ نرگس کھلی، گل لالہ
 کھلا اور سمن کھلا۔ پھول نے اُسے ناز و عشوے دکھائے اور کہا کہ کچھ دیر میرے پاس
 مشہور۔ غنچہ ہنسا اور اُس کے دامن کے کنارے کو کھینچا۔ لیکن وہ سبز پوش جلوہ فروشاں

سے ناآشعار ہتے ہوئے (آگے بڑھتا رہا) اُس نے صحر کو بچاڑا اور پہاڑ کے سینے کو چیر ڈالا۔
تو دین سمندر کی طرح زندہ رہا کہ وہ کس مستی سے دواں رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ میں مست
یعنی اپنے کام میں مگن اور باقی سب سے بیگانہ دواں دواں رہتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور نظم تمنائی میں سے اقتباس سُنئے۔

ہر بحر رفتم و گفتم ہر موج بیستا ہے ہمیشہ در طلب استی چہ مشکے داری؟
ہزار لولوںے تلاست در گریبان درون سینہ چمن گوہر دلے داری
تجید و از لب ساحل رسید و بچ گفت

رو دراز بریدم ز ماہ پر سیدم سفر نصیب! نصیب تو منزلت کہ نیست
جہاں تو پہ تو تو بسپاے تو سخن زارے فروغ داغ تو از جلوہ دلے است کہ نیست
سوئے ستارہ رقیبانہ دید و بچ گفت

(ترجمہ: میں سمندر کے پاس گیا اور اُس کی بیتاب موج سے کہا تو ہمیشہ طلب میں
رہتی ہے آخر تجھے کیا مشکل ہے۔ تیرے گریبان میں ہزاروں خالص موتی ہیں اور تو اپنے
سینے میں میری طرح ایک دل ایسا گوہر رکھتی ہے۔ وہ تڑپنی ساحل سے دور بھاگی اور
اُس نے کچھ نہ کہا۔ میں نے ایک لمبا راستہ طے کیا اور چاند سے پوچھا، سفر تیرے نصیب
میں ہے۔ تیرے نصیب میں کوئی منزل بھی ہے یا نہیں۔ یہ جہاں تیرے عکس اور تیری چاندنی
سے سخن زار بنا ہوا ہے۔ تیرے داغ کا فروغ کسی دل کے جلوے کی وجہ سے ہے کہ نہیں ہے۔
اس نے ستارے کی طرف رقیبانہ دیکھا اور کچھ نہ کہا)

ایک پسماندہ قوم یا فرد کے لئے ترقی کا راستہ بہت کٹھن اور دشوار گزار معلوم
ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر مزہ دہت سے زیادہ سوچ بچار شروع کر دی جائے اور خواہ

کے شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں کہ یہ عظیم کام ہمارے محدود وسائل کے بس کی بات نہیں یا وہ بلند منصوبہ ہماری صلاحیتوں سے بالاتر ہے یا ترقی یافتہ قوموں یا افراد کے مقابلے میں اپنے لئے ہم بلاوجہ احساس کمتری کو روا رکھیں اور عقل و خرد کا غلط استعمال کرتے ہوئے ہم اپنی راہ میں بے شمار ذہنی رکاوٹیں کھڑی کر لیں تو ظاہر ہے کہ ہم ترقی کے راستے پر گامزن ہی نہ ہو پائیں گے بلکہ اپنی مہماندگی ہی میں ترقی کی بندی کو اپنے لئے غیر ممکن تصور کرتے ہوئے صدیوں تک جوں کے توں اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم عقل و خرد کے غلط استعمال کے نتیجے کے طور پر خواہ مخواہ کے شکوک و شبہات پیدا نہ ہونے دیں گے بلکہ عقل و خرد کا صحیح استعمال کرتے ہوئے ایک دلی جذبے سے راستے کی مشکلات کو ہٹاتے ہوئے مستانہ ارادہ اپنے بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک جنون کی کیفیت اپنے دل و دماغ میں لئے آگے بڑھیں گے تو ہر قسم کی رکاوٹ پر قابو پاتے جائیں گے اور وہ دن دور نہ ہوگا جب ہم ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے بندی سے بھگنا رہ جائیں گے۔ خرد کے غلط استعمال جو خواہ مخواہ کے شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے اور دلی جذبے اور کام کرنے کے جنون سے متعلق جو ترقی کے راستے کے ہر پتھر کو تنگی کی طرح بہا کر لے جائے۔ علامہ اقبال نے جگہ جگہ نہایت تفصیل سے اپنے مخصوص انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور قوم کو ابھارا ہے کہ اپنی کم مائیگی اور وسائل کی کمی یا موجودہ مہماندگی سے بے مصلحت نہ ہو بلکہ انتہائی ذوق و شوق اور دلی جذبے سے اپنی صلاحیتوں کو بڑھنے کا لالہ اور اس سلسلے میں ایک جنون کی سی کیفیت پیدا کر کے ہر عظیم سے عظیم ترقیاتی منصوبے کی تکمیل کے پیچھے پڑ جائے۔ کامیابی اس کے قدم چمے گی۔ ملاحظہ ہو۔

تھی از ہاؤ وہو مینا نہ بودے گل ما از شدر بیگانہ بودے
 نہو دے عشق و ایں ہنگامہ عشق اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے
 (ترجمہ: میخانہ شہر و شہب سے خالی ہوتا، ہماری مٹی چنگاری سے بیگانہ
 ہوتی، یہ عشق اور اس کا ہنگامہ نہ ہوتا اگر دل عقل کی مانند عقل و شعور کا مالک ہوتا)
 چوں نرگس ایں چمن ناویدہ نگذرد چوں بُو در غنچہ بیچیدہ نگذرد
 ترا حق دیدہ روشن ترے داد خرد بیدار و دل خوابیدہ نگذرد
 (ترجمہ: نرگس کی طرح تو اس چمن کو بغیر دیکھے نہ گذرے۔ خوشبو کی طرح بیچیدہ
 غنچے میں سے مت گذر۔ حق تنہا نے تجھے بہت روشن آگئیں دی ہیں تو ایسے نہ گزر
 کہ عقل تو بیدار ہو لیکن دل سویا ہوا ہو)۔

سوز سخن ز نالہ مستانہ دل است ایں شمع را فروغ ز پروانہ دل است
 مشتِ گلیم و ذوقِ فغانے نہ اشتیم غمناے ما ز گردشِ پیانہ دل است
 غافل ترے نو مردِ مسلمان نہ دیدہ ام دل در میانِ سینہ و بیگانہ دل است
 (ترجمہ: سخن گسٹری کا سوز دل کےستانہ نالے کی وجہ سے ہے۔ اس شمع کو
 فروغ دل کے پروانے کی وجہ سے ہے۔ ہم ایک مٹی بھر مٹی اور فغان کا ذوق نہ رکھتے
 تھے۔ ہمارا غمنا پیانہ دل کی گردش کی وجہ سے ہے۔ میں نے کوئی بھی شخص مرد مسلمان
 سے زیادہ غافل نہیں دیکھا۔ اگرچہ اس کے سینے میں دل ہے لیکن وہ دل سے بیگانہ ہے)
 عقل خود ہیں دگر و عقل جہاں ہیں دگر است

بالِ بیلِ دگر و بازوئے شاہیں دگر است

و گراست آن کہ ہر دو دانہ افتادہ ز خاک

آں کہ گیر و خورش از دانه پروں وگر است
 وگر است آں کہ زند سیر چین مشعل منیم
 آں کہ در شد نہ منیر گل و نسیم وگر است
 وگر است آں سوائے رو پرده کشا دن نظرے
 ایں سوائے پرده گمان وطن و تخمین وگر است

اے خوش عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
 نوز افروخته دسوز دلی آدم با اوست
 ما ز خلوت کدہ عشق بروں تاختہ ایم
 خاک پارا صفت آئینہ پرواختہ ایم
 در نگر ہمت مارا کہ بہ دارے فلکینم
 دو جہاں را کہ مناں پرده عیاں باختہ ایم
 پیش ما می گذرد سلسلہ شام و صبح
 بر لب جوئے رواں خیمہ بر افروختہ ایم
 در دل ما کہ بریں ویر کن شب نخل رحمت
 آتشے بود کہ خشک و تر انداختہ ایم
 شعلہ بودیم ، شکستیم و شہر گر دیدیم
 صاحب ذوق و تقا و نظر گر دیدیم

ترجمہ : عقل خود ہیں اور چیز ہے اور عقل جہاں ہیں اور چیز ہے۔ جہل کا پڑ
 اور چیز ہے اور شاہین اور باز اور چیز ہے۔ وہ اور ہے جو خاک پر سے گزے ہوئے ہونے

کو اٹھاتا ہے اور جو اوجِ ثریا سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے اور ہے۔ وہ جو کہ نسیم کی طرح چمن کی سیر کرتا ہے اور ہے۔ اور جو گل و نسیم کے خمیر میں داخل نہیں ہوتا اور ہے۔ نہ پروں کے اُس پارتیز قطرے دیکھ لینا اور بات ہے۔ ہر وہ کے اس طرف گمان اور تمن اور تمہیں اور چیز ہے۔ کیا اچھی ہے وہ عقل کہ دونوں جہانوں کی دھنیں اسی سے ہیں۔ چمکتا ہوا نور اور آدمی کے دل کا سوز اسی سے ہے۔

ہم عشق کے خلوت کدو سے باہر نکل آئے ہیں اور پاؤں کی خاک کو ہم نے آئیے کی طرح بھلا دی ہے۔ تو ہماری جست کو دیکھ ہم دونوں جہانوں پر کندہ پھینکتے ہیں اور ہر پوشیدہ چیز کو حیاں کر دیتے ہیں۔ ہمارے پاس شام و سحر کا سلسلہ گزر رہا ہے۔ ہم نے دواں دواں ندی کے کنارے خمیر لگایا ہوا ہے۔ ہمارے دل میں جس نے کہ اس پرانے دیر پر شبِ خوں ڈالا ہوا ہے کوئی ایسی آگ بھی تھی جس میں ہم نے ہر خشک و تر چیز ڈالی ہوئی تھی۔ ہم ایک شعلہ تھے۔ ہم ٹوٹ گئے اور چنگاری بن گئے۔ ہم ذوقِ تمنا اور فطر کے مالک بن گئے۔

اقبالؔ اور اقوام مشرق

آدمیت کی فلاح ہر عظیم شاعر اور ادیب کا، بلا تخصیص زمان و مکان، ہمیشہ
 مطلع نظر رہا ہے۔ مردم بیزار لوگ نہ سوسائٹی میں پسندیدہ گئے جاتے ہیں اور نہ ہی
 مردم بیزار ادیب یا شاعر ادبی مملکتوں میں اپنے مرتبے کے حقدار سمجھے جاسکتے ہیں۔
 تفریح میں بھی آدمیت کی فلاح موجود ہے۔ دن بھر جگہ مہفتوں اور مہینوں کا تھکا ماندہ
 انسان اگر تفریح طبع کے لئے کوئی کچر یا ڈرامہ دیکھے، یا کوئی ناول یا نٹوں کا محبوبہ پڑھے
 اور اُس میں تفریح کا پہلو اُسے نہ ملے تو ظاہر ہے کہ وہ ہریت محسوس کرنے لگے گا۔ لیکن
 ادیب، شاعر، آرٹسٹ، یا ڈرامہ نگار کا کمال یہی ہے کہ وہ لوگوں کی تفریح کا سامان بھی
 مہیا کرے اور اُس کے ساتھ ساتھ تلخ حقائق کا تجزیہ بھی ہمارے سامنے اس انداز سے
 پیش کر دے کہ ہم خواب غفلت کو چھوڑ کر بیدار مغزی اختیار کر لیں۔

آدمیت کی فلاح میں یوں تو روئے زمین کی جملہ آدمیت آجاتی ہے لیکن ظاہر ہے

کہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو ہر شاعر و ادیب بہ نسبت دوسرے ممالک اور معاشیوں کے بہت زیادہ گہری نظر سے دیکھے گا۔ اپنا ماحول اپنا معاشرہ اپنا ملک اور اپنا خطہ ہی ہر شاعر و ادیب کی سب سے بڑی ذمہ داری ہوتا ہے۔ اپنے معاشرے اور اپنے خطے کی خرابیوں کو درست کرنے کی طرف ہی سب سے پہلے اُسے اپنی توجہ منطقت کرنی ہے۔ پھر اُسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ خاتم کون ہے اور مظلوم کون؟ حقدار کون ہے اور اُس کا حق کس نے چھینا۔ اگر کوئی پس ماندہ ہے تو اُس کی وجہ کیا ہے اور اس پس ماندگی کا علاج کیا ہے۔ ایک شاعر یا ادیب ایک بیمار معاشرے کے لئے ایک معالج یا طبیب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی بیماری کی تشخیص اور اُس کے لئے مناسب علاج کا بندوبست اُس کا کام ہے۔

بعض مغربی نقاد اقبال پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس نے صرف اقوام مشرق اور ملت اسلامیہ پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی اور صرف انہی کی فلاح کے ور پے رہے۔

محققوں نے باقی آدمیت یعنی HUMANITY کو کیوں مہلادیا۔ اُن کے خیال میں اس لحاظ سے علامہ اقبال کے کلام میں UNIVERSALITY یعنی آفاقیت موجود نہیں۔

۲۔ ال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال مشرق میں پیدا ہونے اور بدقسمتی سے اُس زمانے میں پیدا ہونے جب مشرق اور ممالک اسلامیہ اقوام افترنگ کے سحر و فریب کے ہاش غلامی اور سستی کی اعتاد گہرائیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ یورپ نے انتہائی بے دردی سے انہیں لوٹ کھسوٹ کر کھن چوروں کے انتہائی ذلت آمیز کردار کا ثبوت دیا تھا۔ اُن کے مال و دولت کی بجائے انہیں مغرب کی ذیابائش کے سامان سے نواز کر اُن پر احسان کیا ہوا تھا۔ انہیں غلامی میں رکھ کر انہیں مسجد کی اعجازت دے کر فر مغزلی کی انتہا کر رکھی تھی۔ ایسے میں علامہ اقبال کی ذمہ داری مشرق اور ممالک اسلامیہ تھی یا

اپنے آقاؤں کے قصیدے گانا اُن کا فرض تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبال کے کلام کا مقصد نہیں بلکہ اُن کی انتہائی عظمت تھی کہ اُنھوں نے اپنے جابر آقاؤں کے خلاف اور قاہر ہتکارینِ ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور واضح الفاظ میں ان کا پول کھولا اور اقوامِ مشرق کو اُن کی غلامی کا پسند آنا چھینکنے پر اکسایا۔ ان کا کلام پڑھ کر اور اُن کے زمانے میں واقعہ جلیا نواز کو یاد کر کے قارئینِ عیش عیش کراٹھتے ہیں کہ ہے کوئی جہاد جو اس سے بڑھ کر ہو۔ اور ہے کوئی بے خوفی اور بلند ہمتی جو اس کی ہم قدم ہو سکے۔ آفاقیت کا مطلب تو ہرگز نہیں کہ جتنی حمایتِ مظلوم کی کی جائے اتنی ہی تعریفِ ظالم کی بھی کر دی جائے۔ وہو کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دینا ہی ایک منصفیت کا فرض ہوتا ہے اور اس طرح مظلوم کو ظالم کے پنجے سے رہا کرانے کی سعی کرنا شاعرِ ادیب کے عظیم مقاصد میں سے ہے۔ اُن کی کتاب ”پس جہ باید کرواے اقوامِ مشرق“ صحیح معنوں میں فرنگی استحصال اور غیر ملکی استعمار کے خلاف ایک جہاد ہے ایک طرف تو اُنھوں نے مشرقی اقوام کو یہ بتا کر اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کا ماضی عظیم الشان رہا ایاتِ کاملہ ہے اور یہ کہ اگر اب وہ پستی کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں تو ایک زمانہ دوستی کہ عظمت اُن کے قدم چومتی تھی اور وہ ایشیا، یورپ اور افریقہ پر مکمل طور پر چھپے ہوئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جدید علوم اور حکمتِ یورپی اقوام کی میراث نہیں بلکہ اُن کی اصل مسلمانوں ہی سے ہوئی اور اُنھوں نے ان علوم و فنون کو ترقی کی منازل تک پہنچایا اب اگر یورپ نے اُنہی علوم و فنون کو اپنا کر اپنے اپنے ملک و قوم کو چار چاند لگا دیئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان اس میدان میں اپنا سکتے نہیں جھاسکتے یا یہ کہ میں ان علوم و فنون سے پرہیز کرنا چاہئے چونکہ خدا نخواستہ یہ فرنگی الاصل ہیں یا ہمارے مذہب

کی کسی طرح نفی کرتے ہیں۔ ہمیں اپنی یہ میراث تو اپنی اقوام سے واپس لے لینے چاہئے البتہ اُن کے لادین معاشرے اور بے اصول لوٹ کھسوٹ سے پرہیز کرنا چاہئے اور اس طرح ایک عظیم عالمی برادری کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔ ثنوی پس چاہیہ کہ اسے اقوام مشرق میں فرماتے ہیں۔

آدمیت زار نالید از فرنگ	زندگی جنگامہ بر چند از فرنگ
یورپ از شمشیر خود بسل فتاو	ذیر گروں رسم لادینی نساو
گروہی اندر پوستین برآ	ہر زماں اندر کمین برآ
مشکلات حضرت انسان از دوست	آدمیت را غم نہاں از دوست
شرخ یورپ بے نزاع قیل وقال	برہ را کرد است بر گرگاں حلال
نقش زاندر جہاں باید نہاد	از کفن و زواں چہ امید کشاو
در جنبہ او چہیت غیر از مکروہن	صید توایں میش داں بخیر من

(ترجمہ) انسانیت یورپ کے ہاتھوں آدھ بچا کر رہی ہے اور یورپ کی وجہ سے اس دنیا میں ہزاروں فساد برپا ہیں۔ یورپ اپنی ہی شمشیر سے کھال ہو کر گر رہا ہے۔ اور اُس نے اس جہان میں لادینیت کی رسم کو رواج دیا ہے۔ یورپ ایک بھیڑیے کی مانند ہے جو بھیڑ کی کھال میں پوشیدہ ہو اور جو ہر وقت بھیڑوں کی کھات میں لگا رہتا ہو۔ حضرت انسان کی مشکلیں یورپ ہی کی وجہ سے ہیں اور انسانیت کی تکالیف اسی کے باعث ہیں۔ فرنگیوں کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے کندھے پر تلوار عیاں رہتی ہے اور وہ ہر وقت انسانوں کے قتل کے ارپے رہتے ہیں۔ یورپ نے شرماً بے حیل و حجت بھیڑوں کو بھیڑوں پر حلال قرار دے دیا ہے۔ اس دنیا میں نئے انداز کی بنیاد رکھنی جانی لازمی ہے کہ کفن چھوڑ

ہے ہیں کیا نجات کی امید ہو سکتی ہے۔ جینو میں (جہاں لیگ آف نیشنز کا ہیڈ کوارٹر تھا) سوائے کروڑوں کے اور کیا ہے۔ وہاں ہی کچھ ہوتا ہے کہ استعماری طاقتیں اپنے شکار کی بندر بانٹ کر لیتی ہیں)۔

علامہ اقبالؒ مشرق کی گزشتہ روایات کے بارے میں فرماتے ہیں :

ہم ہنر ہم دیں ز خاکِ خاورِ راست	دشکِ گروں خاکِ پاکِ خاورِ راست
دانو دیم آخپہ بود اندرِ حجاب	آفتاب از ما و ما از آفتاب
ہر صفت از گوہرِ نیسانِ راست	شوکتِ ہر بحر از طوفانِ راست
ظہرِ ما جو یائے اسرارِ وجود	زوختیں زخمِ از تارِ وجود
اسے امینِ دولتِ تمذیبِ دین	آن یدرِ جیفِ ہزارِ از آستین

(ترجمہ : ہزار مذہب دونوں مشرق کا سرمایہ ہیں۔ مشرق کی پاک سسزمین

آسمان کے لئے باعثِ رشک ہے۔ ہم نے ہر پوشیدہ ہنر اور قدرتی راز کو پایا۔ سوچ ہماری مانند ہے اور ہم سوچ کی مانند ہیں۔ ہر اصول موتی کی ابتدا ہماری وجہ سے ہے۔ اور ہر صفت کی شان و شوکت ہمارے ہی طوفان کے باعث ہے۔ ہماری بلندی فکر نے اس جہلی کے اسرار و رموز کو پایا اور ہستی کے تار پر پہلی ضرب ہیں نے لگائی (یعنی علم و حکمت اور ترقی کے میدان میں سب سے پہلے ہیں آگے بڑھے) اسے تمذیب اور مذہب کی دولت کے امانت دار! اسی روشن ہاتھ کو چہر آستین سے باہر نکال)۔

ان حالات و واقعات کو پیش کرنے کے بعد وہ اقوام مشرق کو فرنگیوں کی غلامی کا جُور اتار چیلنے کی تلقین کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ماہرانہ محرائیں بتاتے ہیں۔ غلط

خود بدانی بادشاہی قاہری است قاہری در عصر اسوداگری است
تختہ دکان شریک تخت و تاج از تجارت نفع و از شاہی خراج
آن جہانباے کہ ہم سوداگر است بر زبانش خیر و اندر دل شر است
مگر قومی دانی حسابش را درست از حریش نرم تر کہ این پشت
بودیائے خود بہ قالیش بدہ بیدق خود را بہ فرخیش بدہ
گوہرش تفت دارد و غیش لگ است نمک ہیں سوداگر از تان لگ است
و ہرن چشم تو خواب نمیش و ہرن تو رنگ و آب نمیش
ہوشمند سے از خم اوسے نخورد ہر کہ خورد و اندھ میں میخانہ مُرد
وقت سودا خند خند و کم فروش ماچر طنائیم د اوشکر فروش
محرم از طلب و نگاہ مشتری ست یارب این سحر است یا سوداگری ست
تاجران رنگ و بوی روند سود ما خریداران ہمہ کور و کبود
آئینہ از خاک تو رست لے مردخ آن فروش دآن پوش دآن بخور

(ترجمہ: تو خود جانتا ہے کہ بادشاہی قاہری ہے اور ہمارے زمانے میں
استعمار اور قاہری سوداگری کے راستے سے آئی ہے۔ سوداگر تخت و تاج کا شریک بن
گیا اور اس نے تجارت کے ذریعے منافع کمایا اور بادشاہت کے ذریعے خراج حاصل کیا۔
اُس دنیا بھر کو زیر نگین لانے والے سوداگر کی زبان پر خیر کی باتیں ہیں لیکن اُس کے دل
میں بدی ہے۔ اگر تو اُس کے حساب کو درست سمجھتا ہے تو اپنے ٹاٹ کو اُس کے منہ
سے نرم اور زیادہ آرام دہ سمجھ۔ اُس کے مال و منافع سے بے نیاز ہو کر گزر جا اور ہرزویں
میں اُس کی چوٹیں کو نہ خرید۔ اپنے باریے کی بجائے اُس کا قالین ست لے۔ اپنے پیادے

کی بجائے اُس کا فزوں حاصل نہ کر۔ اُس کا گہر ناقص ہے اور اس کا لعل عیب دار ہے۔ اس سوداگر کی ٹشک کتے کی ناف سے حاصل کردہ ہے اور اس ٹھکیں بستر پر سونے کی خواہش نے تجھے اندھا کر دیا ہے اور اس کی نخل کی چمک رنگ نے تجھے کیس کا ذکر کیا۔ کسی ہوشمند انسان نے اس کے سینا سے شراب نہیں پی اور جس نے پی وہ اس کے خانہ میں مر گیا۔ رنگ و بو کے تاجرب منافع اکٹھا کر کے لئے اور ہم خریدار تو سب کے سب اندھے اور احمق ہیں۔ اے آزاد مرد جو کچھ تیری خاک سے پیدا ہوتا ہے تو اسے ہی بچہ ۱۰ سے ہی پہن اور اسے ہی کھا۔

انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کا ایک اہم طریقہ کاریہ رہا ہے کہ مشرقی اقوام کو خالصتہً ندی ملائے بنا کر رکھا گیا تاکہ وہ خام مال پیدا کرتی جائیں جسے ترقی انھیں ہرگز نہ کرنے دی گئی۔ اس کے برعکس جلد صنعتیں انگلستان میں لگائی گئیں۔ یہاں تک کہ ایسی صنعتیں بھی جن کا خام مال مشرقی اقوام سے مینا ہوتا رہا۔ خود یہاں کی ضروریات کے لئے بھی اُس خام مال سے یہاں مصنوعات تیار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ خام مال یہاں سے انگلستان جاتا، وہاں اُن سے اُگل پتھر طریقے پر مصنوعات تیار ہوتیں اور پھر وہی مصنوعات مشرقی اقوام کی وسیع منڈی میں فروخت ہوتیں اور جلد بے اندازہ منافع یورپی اقوام کی جیب میں جاتا۔ ملائم اقبال نے مشرقی اقوام کو اس لوٹ کھسوٹ کی طرف متوجہ کیا اور انھیں اپنے استحصال سے نجات حاصل کرنے کی طرف پکارا۔ فرماتے ہیں:

اے زکا پر مصر حاضر بے خبر چرب دستہائے یورپ را انگو

قالی ازا پریشیم تو ساقند باز اور اپیش تو انداختند
(ترجمہ: اے کہ تو زمانہ حال کی کارگذاریوں سے ناواقف ہے تجھے چاہئے

کہ یورپ کی چالاکیوں کو پہچانے۔ اُنہوں نے تیری ہی اُنوں سے قالین بنایا اور پھر اُسے تیرے ہی پاس بے بجا منافع پر فروخت کر دیا۔

یورپ کی تہذیب میں ظاہری ٹیپ ٹاپ کی فراوانی ہے۔ چہرے کی سُرخی مصنوعی ہے جو یا تو سُرخ پادرد کی وجہ سے یا ناؤ، نفوس کی وجہ سے ہے حقیقی طور پر اُن میں صحت ہے اور نہ بدن کی پاکیزگی اور صفائی۔ یوں تو ہفت ہفتہ پھر نہ ٹھاننا اُن کے لئے عین شانِ طہندی ہے لیکن جسم اور چہرے پر حطر و قاذو کی بھر مار ہوگی تاکہ ظاہری نائش و زیبائش میں اُن کے جسم کی نجاست اور روح کی پستی بھر حال چھپی رہے۔ اس ظاہری آبِ تاب سے دھو کر کھا کر اندھا و حند طریقے پر مغربی تہذیب کی نقل کرنا کس کی عقل مندی نہیں، بلکہ مزدوری ہے کہ مشرقی اقوام اپنی قدسیت کو پہچانیں اور محنت اور جد مسلسل سے اپنی مشکلات پر قابو پاتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

چشم تو از ظاہرِ شاموں خور و رنگ دآب او ترا از جان بُرد

وائے آں دریا کہ بوجش کم قیید گو ہر خور را نہ خواصاں خریہ

(ترجمہ: تیری آنکھ اُس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمود و نائش سے دھو کر کھا جاتی ہے۔ اُس کا رنگ اور چمک دمک تیرے ہوش و حواس کھودیتی ہے۔ اُنوس ہے اُس دریا پر جس کی سمت میں تپش کم ہے اور جس نے اپنے ہی موتی کو غوطہ خوروں سے خرید لیا۔

مشرقِ اقوام کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے ایک نکتہ یہ بھی سمجھایا کہ اُن کے دل میں اپنے مقام تک پہنچنے کی آرزو کو خیالی پلاؤ پکڑنے تک ہی محدود نہیں کرنا چاہئے بلکہ اُسے حاصل کرنے کے لئے صحیح منصوبہ بندی اور محنت مشاوق

مزدور ہے۔ آرزو کے ساتھ ساتھ اپنی ہمت پر بھروسہ ہو تو وہ دن دور نہیں کہ کامیابی

ہمارے قدم چومے گی۔ اپنی نظم ”خطاب بہ اقوام سرحد“ میں فرماتے ہیں :

زندگی بر آرزو دارد اساس خوش را از آرزوئے خود شناس

چشم و گوش و ہوش تیز از آرزو مشت خاک کے لالہ خیز از آرزو

ہر کہ تخم آرزو در دل نہ بکشت پاشمال و یگران چوں سنگ و خشت

آرزو سر بایہ سلطان دمید آرزو جام جہاں بین فقیر

آب و گل را آرزو آدم کند آرزو مار از خود محرم کند

تو خودی اندر بدی تعمیر کن مشت خاک خویش را اکیر کن

(ترجمہ : زندگی کی بنیاد آرزو پر ہے۔ تو اپنے آپ کو آرزو سے پہچان۔ انگلیں

کان اور ہوش، آرزو کے باعث تیز تر ہو جاتے ہیں اور مٹی بھر آرزو ہی کے زور پر

گل لالہ پیدا کرتی ہے۔ جس کسی نے آرزو کا بیج اپنے دل میں نہ بویا وہ پتھر اور اینٹ

کی طرح دوسروں کے ہاتھوں پاشمال ہی ہوتا رہا۔ آرزو سلطان اور میر کا سرمایہ ہے اور

آرزو فقیر کا جام جہاں نہا ہے۔ آرزو۔ مٹی اور پانی کو آدمی بنا دیتی ہے اور آرزو ہی

ہمیں اپنے آپ کی واقعیت حال بنا دیتی ہے۔ تو بڑے وقتوں میں تعمیر خودی کر اور

اپنی مٹی بھر مٹی کو اکیر بنا دے۔)

ہندوستان سے اسلامی سلطنت ختم ہو جانے کے بعد اور اسی طرح عرب و ترک

کے عہد عروج کے خاتمہ کے بعد مشرقی اقوام میں یہ خیال عام گھر کر گیا تھا کہ عہدِ ظلم

یعنی سائنس، ٹیکنالوجی، اقتصادیات وغیرہ شاید ایسا ہی ظلم ہیں جن سے ہمیں پرہیز

کرنا چاہئے۔ اس پالیسی پر کافی عرصہ عمل پیرا رہنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی اقوام

زندگی کی دہریں بہت پیچھے رہ گئے اور یورپی اقوام نے ان علوم کو اپنا کر ہم سے اپنا ہا منوایا۔ علامہ اقبالؒ نے اسلامی ممالک پر یہ بات واضح کی کہ جدید علوم کی ابتدا عربوں اور اسلامی ملکوں اور تہذیب ہی سے ہوئی۔ اسلام کے عروج کے زمانہ میں یورپی اقوام توحیات کی تماریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس مسلمان ملکوں نے علوم و فنون اور سائنس و اقتصادیات اور دیگر اقسام دانش میں اس قدر ترقی کی کہ مختلف شعبوں میں اب تک ان کا لوہا مانا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ملحقین فرماتے ہیں کہ ان علوم کی اصل چونکہ میں سے ہے اس لئے ان سے پرہیز کرنے کی بجائے انہیں اپنا لیا جائے۔ مغربی تہذیب سے تو میں اپنا چاہئے جس میں بے حیائی اور عریانیت اپنے عروج پر ہوتی ہے لیکن میں جدید علوم و فنون کو ضرور اپنا کر ان کے ذریعے ترقی کی منازل طے کرنی چاہئیں۔ اپنی نظم "خطاب بہ پادشاہ اسلام" میں حضرت ظاہر شاہؒ میں فرماتے ہیں :-

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است	ایں دو قوت است باری ملت است
آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق	ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعامِ خدائے لایزال	مومنانِ را آں حال است این حلال
حکمتِ اشیا فرنگی زاد نیست	اصلِ اوجِ لذتِ ایسا و نیست
نیک اگر ہیں تو مسلمان زادہ است	ایں گہرازدستِ ما اُفادہ است
چلِ عرب اندر اُردو پا پر کشاد	علم و حکمت را اپنا دیگر مناد
دانہ آں صمرا نشیناں کاشتند	حاصلش افرنگیاں برداشتند

(توجہ! ہمارا سرمایہ کتاب و حکمت ہے۔ یہ دونوں قوتیں قوم کا دھارہ ہیں۔ وہ

ذوق و شوق کے جہان کی فتوحات ہیں۔ دونوں خدا کے لایزال کے انعام ہیں۔ مومنوں

کے لئے وہ جہل ہے اور یہ جہل۔ اس جہان کی حکمتیں یورپیوں کی پیدا کردہ نہیں۔ اس کی اصل سوائے ایساہو کی لذت کے اور کچھ نہیں۔ اگر تو غمزدے دیکھے تو یہ حکمتیں مسلمانوں ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ یہ موتی ہمارے ہاتھ ہی سے گر رہا ہے۔ جب عرب نے یورپ میں پڑ پھیلانے تو علم و حکمت کی ایک دوسری ہی بنیاد رکھی۔ دلائل تو ان صحرائیوں نے بویا لیکن اس کا حاصل فرنگیوں نے برداشت کیا۔

جس قوم کے مرد و زن بے حیائی۔ بے شرمی اور ظاہری زیبائش کے سوا کسی چیز سے متعلق سوچنے سے عاری ہوں جس کے امرا اور جس کے علما ہوں اس قوم کے مردہ ہونے میں اور کون کی کسر باقی رہ جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے ایسی ہی علامات پیش کرتے ہوئے ایک رُہِ ہزوال سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے اور مشرقی اقوام کو ان مذموم حالات سے دُور کا بھی واسطہ نہ رکھنے کا درس دیا ہے۔ اپنی نظم ”حکمتِ فرعون“ میں فرماتے ہیں:

حکمتِ اربابِ کس کراست و فن	مکر و فن ؛ تخریبِ جاں تعمیرِ فن
از حیا بیگانہ پیرانِ کمن	نوجوانانِ چوں زمانِ مشغولِ فن
دردِ دلِ شاں آلود ہا بے ثبات	مردہ زائند از بطونِ اُفتات
دخترانِ اُو بزلِ خود اسیر	شوخِ چشم و خونا و خور و گیر
منہانِ او بخیل و میش و دست	غافل از مغرِ اند و اندہ بندِ پست
از حدِ امر و نہ خود ہیروںِ نجست	روزگارِ شِ نقش یک فردا ز بست
از میاگان و فترے اندرِ بعل	الاماں از گفتہ ہائے بے عمل
دینِ اُو عسجد و خابستنِ بغیر	یعنی از خشتِ حرمِ تعمیرِ دیر
آہِ قدمے دلِ زمین پر داختہ	مردہ مرگِ خویش را زانِ ختہ

(ترجمہ: اہل کینہ کی حکمت مکروہ فن ہے۔ مکروہ فن کیا ہے؟ یہ جان کی تخریب اور جسم کی تعمیر ہے۔ بڑے بڑے جمی حیا سے بیگانہ ہیں اور نوجوان عورتوں کی طرح اپنے جسم سوارنے میں مشغول ہیں۔ اُن کے دلوں کی آرزوئیں بے ثبات ہیں۔ وہ اپنی ماؤں کے پٹیوں سے مردہ پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی لڑکیاں (یعنی رو بہ زوال سوسائٹی کی لڑکیاں) اپنی ہی زلف کی اسیر ہوتی ہیں۔ شوخ چٹم، خرد نما اور پست ہمت ہوتی ہیں۔ اُنس قوم کے امرا انجیل اور عیش پرست ہوتے ہیں۔ اپنے عقل و شعور سے غافل ہوتے ہیں اور اپنی کھال میں مست ہوتے ہیں۔ وہ آج کی حد سے باہر جست نہیں لگاتے اور کسی کل کی تعمیر نہیں کرتے اُن کا کما بالکل بے عمل ہوتا ہے۔ اُن کا دین بے دفاعی ہے یعنی حرم کی اینٹوں سے بنت خاند کی تعمیر اُن کا آئین ہے۔ اُن کا قدم حق کے راستے سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ وہ قوم خود مُردہ ہو چکی ہے لیکن اپنی موت کو کبھی نہیں سمجھتی۔

عالم شرق و غرب - اقبال کی نظریں

علامہ اقبالؒ نے اپنی اندوز زبان کی تصنیف ”غربِ کلیم“ میں عالم شرق و غرب کی سیاسیات، تہذیب اور سرگرمیوں کا علیحدہ علیحدہ منظرِ فائرِ جاذبہ لیا ہے۔ انھوں نے واضح طور پر مشرقین (مشرق و مغرب) میں بسنے والی انسانیت کو گھمن کی طرح کھانے والے عیوب کا بار بار تذکرہ کیا ہے اور انتہائی مصمم ارادے سے انھیں دور کرنے کے لئے اعلانِ جنگ کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خود اپنے کلام میں مسلسل اس امر پر زور دیا ہے کہ اگر کوئی مفہیم تعمیری مقصد پیش نظر ہو تو اس کے حصول کے لئے صرفِ خرد کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا کردہ شکوک و شبہات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک انتہائی دلِ جذبے کے ساتھ جسے انھوں نے جنون کا نام دیا ہے، کام کرنا چاہئے۔ یقینی امر ہے کہ کامیابی اُن کے قدم چومے گی۔ بلکہ یہی اصول انھوں نے دورِ حاضر کے مملکتِ عیوب کو دور کرنے کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے بتظرِ فائرِ حالات کا جائزہ

لیجے سمجھئے مشرق اور مغرب کے رشتے ہوئے ناسوروں کی نشاۃ ہستی کی ہے اور پھر اصلاح کے ایک شدید ولی جذبے کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور جہاد کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ جنگ صاف طور پر ان کے کلام سے واضح ہے۔ کچھ غیب نہیں کہ اقبال کا یقین محکم رنگ لائے اور ان کا جہاد مشرق و مغرب میں خصوصاً مشرق میں، جہاں اُمتوں نے خود جنم لیا اور ایسے دور میں جنم لیا جب وہ پستی کے انتہائی عمیق غار میں پہنچ چکا تھا، ایک انقلاب پیدا کر دے اور وہ اپنی گذشتہ عظمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

نہایش میں نہ یورپ میں سوز و مازِ حیات خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں دلولہ انقلاب ہے پیدا قریب آگئی شاید جہاں پیر کی موت

میں مریض کا سبب ہے غلامی و تقلید وہاں مریض کا سبب ہے اندامِ جمہوری
زمینِ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب کی بری جہاں میں عام ہے قلبِ ظلم کی رنجوری

ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں بار بار نہایت ہی پُر سوز اور درد مہرے انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ ترقی کیسے کریں جب ان میں نہ تو کردار و عمل کی شدت ہے اور نہ ہی اندازِ عیسیت کی فراوانی۔ محکومی۔ فرنگ کی اندھا دُھند تقلید اور تحقیق و جستجو کی حس کے مردہ ہو جانے کی وجہ سے ان کی ذہنیت اس قدر پست ہو چکی ہے کہ وہ خود قربانے نہیں البتہ قرآن کو قربانے کے لئے اپنی اپنی تادیبیں پیش کرتے ہیں تاکہ غلامی کا جواز پیدا ہو سکے۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عیسیت
حلقہٴ شوق میں دو جہازِ اندیشہ کھلیں آہ! محکومی و تقلید و زوال و تحقیق
خود بہلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں ہونے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسکتا ہوا ناقص ہے کتاب کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق
یورپ نے اپنے اور عروج میں ملکیت اور اعتماد پرستی کی جس مذموم ذہنیت کا اظہار
کیا اور جس بے اصول طریقے پر آؤ تو قوموں کی لوٹ کسٹ کر کے ہندوستان کی اور پھر وہاں
کے عوام کا جس طریقے پر استعمار کیا، اس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے جگہ جگہ اپنے
خیالات کا اظہار کیا ہے اور منایت بے غوثی سے فرنگی بیٹیوں کی ذہنیت کا بھی تذکرہ
پھوڑا ہے ۵

موسلین

(اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے)

کیا زمانے سے نرالا ہے موسلین کا جسم؟ بے محل بگڑا ہے مصماں یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کر بڑا لگتا ہے کیوں ہیں سبھی تہذیب کے اوزار ڈھپھلنی میں چھپاج
میرے سوداے ملکیت کو شکرا دے ہو تم تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے دھجج
یہ عجائب شعبہ کس کی ملکیت کے ہیں راہدہ صافی ہے مگر باقی نہ راہ جا ہے نہ راج
آبی تیز چو پٹے کی آبیاری میں رہے اور تم دنیا کے بھر میں نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لٹے بے نوا صحرائشینوں کے خیم تم نے لٹی کشت دہان تپے لٹے تخت و تاج

پر وہ تہذیب میں غارت گری، آدم کش

کل روار کتنی تھی تم نے میں روار کتنا لپکا آج

فلسطینی عربوں کے خلاف فرنگیوں اور یہودیوں کی سازشوں کا جائزہ لیجئے مجھے انہیں
متنبہ کرتے ہیں کہ اگرچہ ان کی بے ادبانه جرات قابل قدر ہے لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے
کہ یہودیوں کی پشت پر تمام مالم فرنگ ہے چونکہ یہودیوں نے انہیں مالی شکست میں جکڑا ہوا

ہے۔ انھوں نے فلسطینیوں کو راہ نجات بتاتے ہوئے انھیں اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانے اور مناسبت خود اعتمادی سے ہر محاذ پر ان کا مقابلہ کرنے کی تحقیر کی ہے۔

دانا اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
ترے دو اند جینا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگ جاباں پھیر رہا ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

۱۹۵۵ء میں اٹلی نے افریقہ کے واحد صیالی ملک حبشہ پر حملہ کر کے اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس پر چڑھائی کی نہ کوئی وجہ جواز تھی اور نہ ہی کوئی ایسی اشد ضرورت جس کی بنا پر اس غاصبانہ قبضے کی حمایت کی جاسکتی۔ پس یورپ کے جھیڑ بولیں کو اپنی ہتھم پندہ کے جوہر دکھانے تھے اور اپنی سلطنت کو دست بخش تھی چنانچہ ایک کمزور اور مرغبال مینج افریقی ملک کو مناسبت بددعائی سے اپنے فوجیں نکالنے میں مجبور کیا۔ حالانکہ وہ خود بھی ایک صیالی ملک تھا۔ گویا ملوکیت، مذہب، نسل یا اصول و ضوابط ہر قسم کے خیال سے بہتر ہے۔

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابلی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردہ دیرینہ قاش قاش

تندیب کا کمال شرافت کا ہے ذوال
فات گری جاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برہ مصوم کی تلاش

اے اے آبرو نے کلیسا کا آئینہ
رومانے کر دیا سب بایزار پاش پاش
پیر کلیسا یہ حقیقت ہے، ہنر اش

ادب اور فنون لطیفہ سے متعلق ملامت اقبال کے خیالات بڑے تعمیری ہیں۔ ان کی نظر میں فطرت کی محض عکاسی کروینا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصلاحی مہم

ہمیشہ پیش نظر رکھے۔ اُسے محض فطرت کا پابند ہی نہیں ہونا چاہئے بلکہ فطرت کو مسخر کرنے کے وسائل کی نشاندہی بھی کرنی چاہئے تاکہ انسانی زندگی میں صلاح و بہتری کی صورت پیدا ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ نے فنکار اور ہنرمند کا مرتبہ اس سے بھی بلند قرار دیا ہے۔ اُن کے خیال میں ایسا ادیب اور فنکار جو کسی قوم کی باطنی صلاحیتوں کو نہ ابھار سکے۔ اُن کے ضمیر کو نہ زندہ کر سکے اور صحیح معنوں میں قوم کے لئے ایک امتحانی اولیٰ رہبر و رہنما نہ ہو ادیب یا فنکار کھلانے کا مستحق ہی نہیں۔ اگر وہ ایک سوئی ہوئی قوم کو جگانے کا فریضہ انجام دینے کے بجائے محض اور محض تفریح کا سامان ہی مہیا کرنے پر اکتفا کرتا ہے تو اُسے قوم کا میت برابری ہی کہا جاسکے گا قوم کا میسا تو ہم اُسے نہ کر سکیں گے جو اُس کا صحیح مقام ہے۔

کس درجہ سیاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مستند جمعی بھی
معلوم ہیں اُسے مردِ ہنر تیرے کلمات
صفت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

اے اہلِ نظر و ذوقِ نظر خوب ہے لکھی
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
جس سے دلِ دریا مستلطم نہیں ہوتا
شاعر کی ذرا ہو کہ معنی کا نفس ہو
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں تو ہیں
جو ضربِ بکھی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

غیر منقسم ہندوستان میں اور پاکستان بننے کے بعد یہ مسئلہ خاص طور پر متنازعہ فیہ بنا رہا ہے کہ آیا فن کو کسی تعمیری مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہئے یا اسے صرف تفریح محض

کے طور پر ہی دماغی عیاشی کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے۔ ایک طبقہ ایسا تھا اور اب بھی ہے جو فن سے کسی قسم کے بھی تعمیری کام لینے کے خلاف ہے چاہے وہ قلمت کے ترقی مردوں میں مدوح پہنکنے کے مترادف ہی کیوں نہ ہو۔ بعض لوگ تو ادب برائے زندگی کا مضامین ہی مطلب لئے ہوئے ہیں کہ اس سفرے کا مطلب ہی سوشلزم کو مضبوط بنانا ہے۔ لہذا اس کی مخالفت ہی میں آواز بلند کی جانی چاہئے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ ادب برائے زندگی سے تو یہ مراد ہے کہ ادب اتنا دلکش اور حسین ہونا چاہئے کہ اس سے زندگی کے دکھوں کو دور کرنے کا مداوا تفریح کی صورت میں بھی ہو اور اُس کے ساتھ ساتھ اس میں اتنی اہمیت بھی ہو کہ وہ حتی المقدور اپنے ماحول اپنے معاشرہ۔ اپنے ملک بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ہر قسم کی بُرائی کو بغیر عین دیکھے اور قوم کے مصالح کے طور پر اُن بُرائیوں کو دور کرنے کی ترغیبیں قوم کو بتائے ہوئے اُن کے خلاف سراپا جہاد ہو جائے۔ بعض حضرات ملامہ اقبالؒ کے بارے میں بھی یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ وہ ادب برائے زندگی کے نہیں بلکہ ادب برائے ادب کے قائل تھے۔ میں حیران ہوں کہ وہ کس طرح اس غلط نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ملامہ اقبالؒ کے کلام کا جتنا بھی مطالعہ کیا جائے اتنی ہی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ملامہ اقبالؒ تو 'تقریباً' مذہب کی نشاۃ ثانیہ اور بین الاقوامی طور پر دور حاضر کی مشرق و مغرب کی تہذیب کے محبوب کو رفع کرنے کی تدبیر میں اس قدر زیادہ مستغرق تھے کہ ان کا ایک شعر میں بس عظیم مقصد سے عاری معلوم نہیں ہوتا۔ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود بھی انہیں بعض تفریح طبع کا ہی مرقع سمجھا جائے۔ خود ملامہ اقبالؒ ہندوستان ہند کے بارے میں یوں فرماتے

ہیں۔

عشقِ دوستی کا جنازہ ہے تخیلِ ان کا ان کے اندیشے تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقشہ گری ان کے منہ خانوں میں زندگی سے ہزاروں برسوں کا بیسزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند کہتے ہیں مدح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گرد افسانہ نویس

آدم بچاروں کے احصاب پر عورت ہے کوا

معاشرے میں عورت کے مقام سے متعلق علامہ اقبالؒ نے جگہ جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ آدمیت کے احترام کی طرح وجود زن کی اہمیت اور اس کے احترام پر بھی انھوں نے بہت زور دیا ہے۔ انھوں نے متعدد بار اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگرچہ مرد و مختلف میدانوں میں عورتوں سے کہیں زیادہ عروج کے مقام پر پہنچے ہیں اور انسانیت کی فلاح کے سلسلے میں جن شخصیتوں نے نام پیدا کیا اگرچہ ان میں بہت زیادہ تعداد مردوں کی ہے لیکن ان سب شخصیتوں کی تخلیق اور بنیادی تربیت تو آخر عورتوں نے ہی کی۔ لہذا ان عورتوں کے مقام کا اندازہ ہم کر سکتے ہیں جنہوں نے ایسے ایسے درخشندہ ستاروں کو جنم دیا۔ آزاد بی نسواں کے سلسلے پر علامہ اقبالؒ کے خیالات بہت متوازن ہیں۔ وہ آزاد بی نسواں کے پُر زور حامی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ دخترانِ ملت پر یہ چیز واضح کرتے ہیں کہ بے معنی آرائش و زیبائش کا شرق اور ذرقِ برق زیورات کی کشش بے معنی ہے۔ انھیں آزاد بی نسواں کی قدس کرتے ہوئے دل و نگاہ کی قوتوں کو تیز تر کرنا چاہئے اور بحیثیت ماں، بیوی، بہن اور بیٹی کے اپنی فتنہ واریوں کو پہچانتے ہوئے ولی جذبے سے اپنے فرائض کو عملی جامہ پہنانا چاہئے تاکہ وہ سوسائٹی کی ترقی و تعمیر میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ زیبائش آرائش کے پیچھے بے معنی طریقے سے بھاگنے کی انھوں نے واضح طور پر مذمت کی ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر فرنگی معاشرت کو نشانہ دہن بنا یا ہے۔ آزاد بی نسواں کے نام پر بے حیائی

اور بے شرمی کی جرد باوہاں چلی ہوئی ہے اور اب اُن کی تقلید میں مشرق بھی اُسی ڈگر پر چل نکلا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسے بر ملا طور پر زندہ تہذیب کے لئے نمونہ قرار دیا ہے، مرد و عورت کے درمیان متوازن تعلقات اور مرد و عورت کی حفاظت کا عناصر قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بد راہ عورتوں کی بے راہ روی کا بھی اُنہوں نے بنیادی طور پر مرد کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اُن کے خیال میں عورت ذات بنیادی طور پر شریف ہوتی ہے اور شرافت کی زندگی ہی کو پسند کرتی ہے لیکن یہ مردوں کی زن شناسی ہے کہ وہ خود غرضانہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اُنہیں غلط راہ پر چلنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ چنانچہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ	اسی کے سارے زندگی کا سوز و دل
شریف میں بڑے کے شریا سے شہت نکالے گی	کہ ہر شرف ہے اُسی وسیع کا اُپر کمون
مرکا لہاتہ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن	اسی کے شعلے سے ٹوٹا ستر ابراہیمؑ

آزادی نسواں

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا	گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ ہر ہے وہ قد
کیا فائدہ کچھ کہہ کے جنوں اور بھی سرتوب	چیلے ہی خفا مجھ سے میں تہذیب کے فرد
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی گئے فاش	مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش ہمت میں زیادہ	آزادی نسواں کے زمرہ کا گلہ بند

عورت کی حفاظت

نئے پردہ نہ تقسیم - نئی جو کو پرانی
نسوانیت زن کا نگہاں ہے نقطہ

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زود

جنود باجیکوں نے اس کو ٹھکرایا مگر یہ مسئلہ اُن ردا دہیں کا وہیں

قصہ اُن کا نہیں ہے کچھ افسانہ میں گواہ اس کا شرف پہ ہیں مدد پروں

فشار کا ہے تاریکی معاشرت میں ظہور کو مرد سلاہ ہے چارہ زن شامش نہیں

عورتوں کی تعلیم جو بہتر ہے حاضرہ کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم پر بھی زور دیا ہے تاکہ وہ

قلب و تنقیر کی روشنی سے محروم نہ ہونے پائیں اور اپنے نطفے کی پہچانیں نہ

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگب اُمتوت ہے عزت اُن کے لئے کائنات کا شرفوت

جس علم کی تاثیر سرسبز ہوتی ہے اُن کے لئے علم کو ادب و ادب کا شرفوت

بیگانہ ہے جو یہ کہ اگر حد سے زور ہے عشق و محبت کے لئے اُن کو ہر شرفوت

انگریزوں نے جہاں نے جو تعلیمی نظام نہ بچ گیا ستادہ سرسبز اُن کے اپنے مسائل کو رہتا

انہیں سرکاری دنا ترسوں کے لئے کارکن کھدک فرنگ کی عزت تھی اُن کے لئے محوری بہت

انگریزوں کی تعلیم لازمی تھی اس کے علاوہ وہ ہرگز یہ نہ چاہتے تھے کہ انہیں ایسی تعلیم مل جائے

جس سے اُن کے دل میں آزادی کی آواز پیدا ہو یا انقلاب کے جذبات پیدا ہوں بلکہ وہ

فرنگی اور تغیر پرستانہ فلسفے اُن کے لئے سکولوں میں رکھوں میں رائج کیا گیا جس سے ان قوموں

کے مذہب و تہذیب کا ہمیشہ کے لئے ہی خوابیدہ کر دیا جائے اور جیسے کی بہت ہی ان میں کروش

خلف۔ علامہ اقبال نے ایک مابہرہ نالباش کی طرح اس سب کو محسوس کیا اور ہمارے دلوں کے

ان جذباتی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے قوم کے علمبرداروں کو اس پر واضح کیا کہ وہ علم کو سون

انگریزوں کی راج گروہ کتب پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہئے جو ان کی جتنی صلاحیتوں کو بیدار

کرنے کی بجائے اُن کو ختم کرنے کے واسطے رہتی ہیں بلکہ اپنی خودی کو بیدار کرنے یعنی اپنی صلاحیتوں سے مکمل طور پر استفادہ کرتے ہوئے انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ تعمیری کام کرنا چاہئے اور مردانِ مجاہد کے لئے انقلاب سے اُترنے کی بجائے عظیم سے عظیم خطرے سے ٹکرانے اور اس پر قابو پانے کی ہمت پیدا کرنی چاہئے اور صرف اسی صورت میں وہ اپنی اور قوم کی قسمت بدل سکتے ہیں۔

ہندی کتب

اقبال یہاں نام دے ملے علم خودی کا	مردوں نہیں کتب کے لئے ایسے مقامات
بہتر ہے کہ بچائے سولوں کی نظر سے	پیشہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کلاں مل	کس درجہ گراں سیر میں محکوم کے ادعات
آزاد کا ہر محظہ پیامِ ابدیت	محکوم کا ہر محظہ نئی مرگِ مفاہات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور	محکوم کا اندیشہ گرفتِ اغواغات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا	ہے ہندو آزاد خدا کا زندہ کرامات

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیتِ اچھی
موسیقی و صورتِ گری و علمِ نباتات

تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے	زندگی سوزِ مجبور ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے نصرت بھی ہے قوت بھی ہے	ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اس کا سُرائے
اہلِ دانش نام ہیں کیا اب ہیں اہلِ نظر	کیا قہقہہ ہے کہ خالی رہ گیا تیرا دماغ

شیخ کتب کے طریقوں سے کٹا ہوا دل کہاں کس طرح کبریت سے روشن ہو بھلی کا چراغ

طالب علم

خدا تجھے کسی طرف سے آشنا کر دے کہ تیرے بھر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ملکی نہیں فراغ کر تو کتاب خواں ہے گر صاحب کتاب نہیں

مدرسہ

عمرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے قبض کی، روح تری مٹے کے تجھے فکرِ ماضی
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا زندہ گی ہے موت کھودتی ہے جب فوقِ خواش
اس جہنم سے تجھے تعلیم نے بیگا دیا جو یہ کتا ستاخوڑے کہ بانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدہ شاہیں بخشا جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کو وہ بیاباں میں دوا سرار میں فاش

اساتذہ

مقصد ہوا اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں بے سود ہے جھٹکے بجائے خورِ شہید کا پیر تو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرقتا کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی ٹنگ دو

کر رکھتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہتے دماغ اپنے زمانے کے ہیں پرورد

دین و تعلیم

مجھ کو معلوم ہیں یہ ان حرم کے انداز
اور یہ اہل کلیسا کا قفسِ اہم تعلیم
اس کی تقدیر میں محکومی و غلوی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

فطرتِ انرا سے اعراض بھی کر لیتی ہے

کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

افغانستان کے ساتھ اپنی محبت اور خلوص کا اظہار علامہ اقبال نے اپنی مختلف تصانیف میں جگہ جگہ مناسبت پر دروازہ انداز میں کیا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کی سات سو اسلامی تاریخ میں افغانستان نے ہمیشہ ایک درخشاں کردار ادا کیا ہے۔ جب بھی وہلی کی مرکزی ہونے لگتی اور اسلام کی نیاسیاں ڈولنے لگتی کوئی نہ کوئی مہابد افغانستان کی سرزمین سے اٹھتا اور اس ڈولتی ہوئی کشتی کو پھر سہارا دے کر اسلام کا عہدِ بلند کرتا۔ محمد بن حوزی اور محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک جتنے بھی اسلامی حکمران ہندوستان پر تخت نشین رہے ہیں ان سب کی اصل کابل کے تخت سے ہی تھی۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس برصغیر میں اسلام کی اشاعت کابل کے ابنِ عظیم فرزند اہل کے زیر سایہ ہی ہوئی۔ چنانچہ اکثر تصانیف میں علامہ اقبال نے شاہِ افغانستان کو بادشاہِ اسلام کے نام سے مہسوم کیا ہے اور افغان قوم کی موجودہ بحالی اور بے مٹی پر خون کے آئینہ جاتے ہوئے اپنی اصل اور عظمت یاد کرنے کی تلقین کی ہے اور اسی گزشتہ کردار وہلی سے اسلام کی سرفرازی کی طرف اُنھیں اُل کیا ہے۔ ضربِ کیم میں محرابِ گلِ افغان کی

منتقل نظموں کا ترجمہ علامہ اقبال نے ضایت و مکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک اقباس
ملاحظہ ہو ۵

رومی بدلے شامی بدلے ، بدلا ہندوستان

تو بھی اسے فرزندِ کوہستان اپنی خودی پہچانی

اپنی خودی پہچانی

او غافلِ انسان

موسمِ اچھا ، پانیِ دافرا ، مٹی بھی زرخیز

جس نے اپنا کمیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچانی

او غافلِ انسان

ادبچی جس کی سر نہیں ہے وہ کیسا دریا

جس کی ہوائیں ششہ نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچانی

او غافلِ انسان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ

اُس بندے کی دہقانی پر سٹھانی قربان

اپنی خودی پہچانی

او غافلِ انسان

یتیمی بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی گنج

عالم فاضل بچا ہے جس اپنا دین ایمان
اپنی خودی پہ پان
اور فاضل نشان

دانا کے راز

علامہ اقبالؒ نے اپنی تصنیف ”زہدِ عظیم“ میں جہاں قوم کو ترقی و تعمیر کے راستے پر نہایت تیزی سے گامزن ہونے کے دھڑو دکشاں اور عام فہم پیرائے میں بتائے ہیں اُس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے انہی دلائل کی حمایت میں اہم اور دقیق فلسفیانہ نکتوں کی بھی نہایت تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ علامہ اقبالؒ خود بہت عالم و فاضل آدمی تھے۔ ڈبل ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری یورپ سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اُنہوں نے یورپی، مشرقی اور اسلامی علوم و فلسفہ کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامی تعلیمات و فلسفہ ہی ”بشرطیکہ روش“ ضمیرِ سچے اُس کی تائید کی جائے اور صوفی و ملا کی تاویلات کو صحیح نہ مان لیا جائے بہترین اور ادنیٰ ترین تعلیم اور فلسفہ، نوعِ انسانی کے لئے پیش کرتی ہیں۔ اور انہی پر عمل کرنے میں اُن کی نجات مضمر ہے۔ خصوصاً مسلم اقوام کی طرف اُن کا دُعا سننے ہے کہ وہ اپنے اسلام

کی غفلت رفتہ کو دوبارہ پالینے کے لئے اسلامی تعلیمات کی مدد کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس سلسلے میں کاوش مسلسل سے نہ گھبرائیں۔ اس راستے میں ناکامیاں بھی ہو سکتی ہیں لیکن مسلسل کوشش کا پھل جلد یا بدیر ضرور ملتا ہے۔

میں شود پر دہ چشم چر کا ہے گا ہے دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگا ہے گا ہے
 داوی عشق بے دور دراز امت لے طے شدہ جاوہ صد سالہ آبے گا ہے
 در طلب کوش دمہ دامنِ مید بندست دولے ہمت کو یابی سر رہے گا ہے

(توجہ: میری آنکھوں کا پردہ (یعنی آنکھوں کے سامنے رکاوٹ پیدا کرنے والا پردہ) بعض دفعہ گھاس کے ایک تنکے کی برابر رہ جاتا ہے اور میں نے اس طرح بعض دفعہ دونوں جہانوں کو ایک نظر میں دیکھ لیا ہے۔ عشق کی داوی (یعنی منزل مقصد کی داوی) اگرچہ بہت دور ہے لیکن بعض دفعہ سو سالوں کا راستہ ایک ہی آہ میں طے ہو جاتا ہے۔ تو کوشش میں متواتر لگا رہو اور اُمید کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اس طرح کبھی کبھی ایک دولت کی دولت راستے کے کنارے پڑی ہوئی مل جاتی ہے۔)

مشرقی فلسفہ حیات کو اپنانے اور فرنگی تہذیب و فلسفہ کے چیمپے اندھا دھند نہ

بھاگنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

کشیدی بادہ ہا در صحبت بیگانہ بے درپے

بنور دیگر ایں افزودختی پیانہ بے درپے

دوست ساقی خاور دو جامِ ارغواں درکش

کہ از خاک تو خیزد تالاستان بے درپے

دلے کو از تب و تابِ تہ آشنا گرد

زندہ بر شعلہ خور صورت پروانہ پے در پے

مگدہاں جامِ دوزہنگشاں فرنگ کستر گوئے

ہزاراں کا رواں گزشتہ ایں پروانہ پے در پے

(ترجمہ : تو نے خیزوں کی محبت میں متواتر شراب پی ہے اور دوسروں کے دُور سے

بار بار اپنے پیماں کو روشن کیا ہے۔ مشرقی ساقی کے ہاتھ سے بھی دوارِ خوانی جام پی کر نہ

تیری خاک سے متواترستانِ تالے بلند ہو رہے ہیں۔ ایسا دل جو فنا کی تباہی سے آشنا

ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو شعلے پر پروانے کی صورت بار بار بنا رہا ہے۔ تو صبح صادق کے

آنسوؤں سے زندگی میں پھل اور پھول پیدا کر۔ جب تک کہ تو بار بار دہانہ نہیں ڈالے گا تیری

کھیتی ویران ہو جائے گی۔ جام کو گروہِ ش میں لا اور فرنگ کے ہنگامہ کے بارے میں کم باتیں

کر۔ اس ویرانہ سے ہزاروں کا رواں کیے بعد ویرانہ گزرے ہیں۔)

ان اقتباسات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ نے مشرقی فلسفہ پر زور دینے اور

اندھا مہند مغربی فلسفے سے احتراز کرنے کے ساتھ ساتھ نائنٹیہم جنس یعنی دن رات کی محنت

شاقہ۔ تباہی و تباہی یعنی دکھ و تنہائی کو پالنا اور اُن کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد

مسلل سے کام لینا اور انکسب سبک دہی یعنی سچی خیزی کی عادت اور محنت شاقہ پر بھی ہر

قدم پر زور دیا ہے۔ اُن کا مقصد واضح ہے کہ فلسفہ یا علوم، ہم کیسے ہی روشن اور اعلیٰ

اپنائیں جب تک اُن کی تعلیمات پر عمل کرنے کے سلسلے میں ہم محنت شاقہ اور دلی جذبے سے

کام کرنے کی عادت نہ اپنائیں گے وہ سب فلسفہ و تعلیمات دھڑکی کی دھڑکی رہ جائیں گی۔

بلکہ ہماری بے عملی کی وجہ سے ان تعلیمات کی بھی سبک دہی جیسا کہ دورِ حاضر کے عالمِ اسلام

کی بے عملی نے اسلام کی مندر تعلیمات کا حشر کیا ہے۔ مغرب کا فلسفہ اور تعلیمات اسلام

کی تعلیمات کی نسبت بہت فرومایہ ہیں۔ اسلام خود کے استعمال کے ساتھ دل جذبات کے احترام پر زور دیتا ہے۔ جو خود کے غلط اور بے جا استعمال سے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ اس کے برعکس مغرب نے صرف خود کے استعمال پر زور دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ مادہ پرستی کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں جس سے ملوکیت اور استعمار اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے مشرقی ممالک کی لوٹ کھسوٹ جسے مغربی ممالک نے اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ (اسی خود کے دماغ استعمال کی وجہ سے ہوا۔ خود کے بے رحمانہ استعمال کی اسی قسم کی زد اگر چل نکلی تو وہ دین و دوزخ میں کہ تہذیب و تمدن اور ترقی ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ اس طرح جہاں علامہ اقبالؒ نے مذہب و سیاست یا ملک و دین کے درمیان متوازن ہم آہنگی پر زور دیا ہے اس سے بھی یہی مراد ہے کہ سیاست میں جب تک مذہب اور دلی جذبات کا احترام موجود نہ ہو جس سے بحیثیت مجموعی آدمیت کی بہتری اور مختلف طبقات سے صفحہ سلوک بنی مراد ہے تو ایسی سیاست سیاست زدہ ہے گی بلکہ سفاک بن جائے گی۔

یورپ نے گزشتہ ایک دو صدیوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور مسلمان جو اپنے کمال کے بعد زوال پذیر رہے ہیں تو اس کو دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی فلسفہ معاشی نظام اور طرز حکومت لازمی طور پر اسلامی و مشرقی نظام مٹے معاش و حکومت اور علم سے لازمی طور پر بہتریوں گے جیسی تو وہ دور جا ستر میں ہم سے بازی لے گئے ہیں۔ لیکن یہ طرز استدلال کسی طرح صحیح نہیں۔ مغرب کو ترقی تو اس طرح ہوئی کہ انھوں نے ہمارے علوم و فلسفہ سے تو بھرپور استفادہ کیا اور خود کی کامیابیوں کو عروج تک پہنچایا لیکن مذہبیت اور دلی جذبات سے ہماری جوتے کی وجہ سے استعمال کو ترقی کی حد تک پہنچا دیا اور مادہ پرستی ہی کو میں ایمان سمجھا۔ اس کے علاوہ تہذیب مغربی نے

میں مذہب سے مکمل بیگانگی کی وجہ سے بے حجابی۔ بے شرمی اور بے غیرتی کی جو انتہا کی ہوئی ہے وہ بالآخر ان کی اپنی خودکشی پر ہی منتج ہوگی۔ اس کے برعکس دورِ حاضر کے مسلمانوں نے اسلام کی دعوت کو غیر مسلموں کے سپرد کر کے خود صرف اسلام کے نام کو بیچنے اور فرنگیت کی ہر قسم کی برائی کو اپنانے میں ہی اپنی شان سمجھی۔ کاش ہم لوگ اپنے اسلاف کی عظمت سے سبق سیکھتے، ان کے کارناموں کی وجہ ڈھونڈتے اور کرار و عمل کا جائزہ لیتے ہوئے ان ہی کی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اپنے دورِ جاہلیتِ ثانی کا خاتمہ کرنے کے قابل نہ ہو جاتے۔ آخر مغربی اقوام بھی تو وہی دنیا کی باسی ہیں اور ان قوموں کے افراد ایسے جیسے گوشت پرست کے انسان ہیں۔ اگر وہ اپنے نسبتاً ادنیٰ فلسفہ و حکمت کے باوجود اس حیرت انگیز ترقی کا باعث بن سکتے ہیں تو ہم اپنے شاندار ماضی اور تابناک روایات کے باوجود ان کے ہم پل کیوں نہیں ہو سکتے یا ان سے بازی کیوں نہیں لے جا سکتے۔

بیا کہ خاورِ یابِ نقشبِ تازہ بستند و گروہِ بطراہِ بجے کہ بشکستند

چہ جلوہ ایست کہ دہلا طہنتِ نگے ز خاکِ راہِ مثالِ شرارہ بر جستند

تو ہم بدوقِ خودی نہں کہ صاحبِ طریق بریدہ از ہر عالمِ تجویشِ پیوستند

غلامِ بہتِ بیدارِ آں سوارِ نام ستارہ را بسناں شستہ و گرہ بستند

(ترجمہ: اگر مشرقیوں نے تازہ نقوش استوار کئے ہیں۔ دوبارہ اُس بُت کے طواف میں مت جا، جیسے اُنہوں نے توڑ دیا ہے۔ یہ کیسا جلوہ ہے کہ اُس کی ایک جھلک کی لذت کے لئے راستے کی خاک سے چنگاری کی طرح اُچھل پڑے ہیں۔ تو بھی اپنی خودی کے ذوق و شوق سے وہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ سب دنیا کو محصور کر اپنے آپ سے پرست

ہو جاتے ہیں (یعنی اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے پر بروئے کار لاتے ہیں) میں اس سوار کی
 بیدار محبت کا غلام ہوں جس نے تمام کے اپنے نیزے میں پرو کر اپنے دامن میں باندھ لیا۔
 اس اقتباس میں جیسا کہ ظاہر ہے مشرقی نقوش کو ثبات دینے کے علاوہ بلند ہستی
 پر بھی زور دیا ہے۔ بلند ہستی کی توضیح علامہ اقبالؒ یوں کرتے ہیں کہ کسی ایک بلند
 مقصد کو حاصل کر لینے کے بعد آدمی کو چاہئے کہ مطمئن ہو کر اپنی جدوجہد چھوڑ نہ دے
 بلکہ اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لا کر اس سے بھی بلند تر اور بھر اس کے بعد
 مزید بلندی پر پہنچنے کے لئے جدوجہد جاری رکھے۔ اور اس طرح تمام عمر بلند سے بلند
 پروازی کا شوق پورا کرتا رہے تو کیا عجب کہ وہ عقل و دل و نگاہ اور دست و پا کی کشت
 کی الگ الگ انتہائی منزلوں تک پہنچ جانے میں کامیاب نہ ہو جاتے۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آست ناطلب
 ہم نہ خدا خودی طلب ہم نہ خودی خدا طلب
 از غلبش سر شمشہ کار نمی شود تمام
 عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب
 عشق بسر کشیدن است شیشہ کائنات را
 جام جہاں نہا بجو دست جہاں کشت طلب

(ترجمہ: سب لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر اور کسی دانا سے ناز کی صحبت کا طالب
 ہو۔ خدا سے بھی خود طلب کر اور خودی سے بھی خدا کا طالب ہو۔ غلبش ایسی ہو کہ کسی ایک
 کامیابی کو اپنے کام کی انتہا نہ سمجھا جائے بلکہ عقل، دل اور نگاہ کے لئے الگ الگ
 جلوے طلب کئے جائیں۔ کائنات کے شیشے کے آخری سرے تک پہنچ جانے کا نام عشق

ہے۔ توجاہ جہاں نما کی تلاش نہ کر بلکہ ساری دنیا کو فتح کر لینے والے باندگی خواہش کر)۔
 صراطِ مستقیم کی طرف لے جانے والے تشکلات (بلند خیالی) کی وضاحت کرتے
 ہوئے فرماتے ہیں :-

درویں سینہ آدم چہ نہراست	چہ نہراست ایں کو غیب اچھنور است
شمار روزگار کشن از نفس نیست	چنین جویندہ و یا بندہ کس نیست
گئے داماندہ و ساحل مقامش	گئے دریائے بے پائیاں بسبب منش
ہمیں دریا ہمیں چوبِ کلیم است	کہ از دے سینہ دریا و در نیم است
غزالے مرغزار کشن آسمانے	خورد آبے ریز جوئے ککشدنے
ز جوئے خلیش بحرے آفریند	گھر گردو بہ قصر خود نشیند
ہیام صوری دیگر پذیرد	شود خواص و خود را باز گیرد
دروہنگہ مرہائے بے نمائش است	درد رنگ و صدا بے چشم و گوش است
حیات اندے بر اندازد کندے	شود صیاد ہر پست و بلندے
ازد خود را بہ بند خود در آرد	گلونے ماسوا را ہسم فشارد
وہ عالم می شود از دے شمارش	فتد اندر کندے تا ہمارش

(ترجمہ : آدمی کے سینے میں یہ کیا نذر ہے کہ غیب میں اللہ تعالیٰ کا پر تو مسلم
 ہوتا ہے۔ اُس کا شمار سائنس کی وجہ سے نہیں ہے۔ ایسا ڈھونڈنے والا اور پانے والا)
 یعنی کامیاب جدوجہد کرنے والا) کوئی شخص نہیں ہے۔ کہیں وہ ٹھکا ہوا جو آپ تو سائل
 اُس کا مقام جو آپ اور کہیں بغیر کتابت والا سمندر اُس کا سیرا ہوتا ہے۔ یہی وہ سمندر
 ہے اور یہی وہ کلیم کا عصا ہے جس کی وجہ سے سمندر کا سینہ دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا

مہن ہے جس کا مہرزار آسمان ہے ۔ یہ کشتاں کی ندی سے پانی پیتا ہے ۔ اپنی ندی سے
ایک سمندر پیدا کرتا ہے ۔ اُسی وقت وہ دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ وہ حوام بن
جاتا ہے اور اپنے آپ کو دوبارہ حاصل کر لیتا ہے ۔ اُس میں بغیر شے کے ہنگامے موجود ہیں ۔
اُس میں بغیر آنکھ اور کان کے رنگہ اور آواز ہے ۔ زندگی سے اُس سے کندھیں کی جاتی
ہے اور وہ ہر پست اور بلند کی عیاں بن جاتی ہے ۔ وہ اپنے ہی ذریعے اپنی صلاحیتوں پر
قابو پالیتا ہے اور اسوا کے گلے کو بھاڑ کر رکھ دیتا ہے ۔ دونوں جہان اُس کا شکار بن
جاتے ہیں اور ان کی جگہ اُس کی کندھیں آ جاتی ہے ۔
علم اور شعور و آگہی کو حیات پر نفس کے بگرداں کا کنارہ بتاتے ہوئے اس مسئلے
کی وضاحت دیوں فرماتے ہیں ۔

حیات پر نفس بگردانے	شعور و آگہی اور اکرانے
چہ دیانے کثرت و موج بار است	ہزاراں کوہ و صحرا بر کنار است
مہر میں از موج ہائے مہر آتش	کہ ہر موجش چون جست از کنارش
گذشت از بگرد صحرائے دو	نگہ را لذت کیف و کئے داو
بر آں چیزے آید در شعورش	منور گردد از بغیر شعورش
بخولت مست و حجت ناپذیر است	ولے بر شے ز نذرش مستیر است
نقشیں می نماید مستیزش	کند آخر با سنجے اسیرش
شعورش با جہاں نزویک گردد	جہاں اورا ہر انداز و خبر گردد
خود بند نقاب از رخ کشورش	و لیکن خلق عریاں تر نمودش
تکجہ اندرین دیر مکا فات	جہاں اورا مقامے از مقامات

دو ترجمہ : سالنوں سے بھری ہوئی زندگی ایک بتا ہوا سمندر ہے۔ شور و آگاہی اس کا کنارہ ہے یہ ایک ایسا سمندر ہے جو موتوں اور موجوں سے بھرا ہوا ہے کہ جس کی ہر موج ایک نئے کنارے سے باہر پھلانگ کر پہنچی۔ وہ سمندر سے باہر نکل آئی اور اس نے صوفی کوئی عطا کی۔ اس نے نگاہ کو کیفیت و سرور کی لذت دی۔ اس کے سامنے جو چیز بھی آتی ہے وہ اس کے شور کے فیض سے منور ہو جاتی ہے۔ وہ خلوت میں مست اور اس کی صحبت میں ناقابل پذیرائی ہے۔ پہلے تو وہ اپنا نور دکھاتی ہے اور آخر کار اپنے آئینے میں اسے اسیر کر لیتی ہے۔ اس کے شور نے دنیا سے اسے نزدیک کر دیا۔ جہاں نے اسے اپنے راز سے خبردار کر دیا خور نے نقاب کا بند اس کے چہرے سے کھول دیا لیکن غلطی نے زیادہ وضاحت سے اس کی ناشکی کی۔ وہ اس پر کفایت میں نہیں رہتا۔ یہ جہاں اس کے لئے بہت سے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔

بے یقینی اور ولی جذبے سے کئے جانے والے بلند مقصد کام میں یقین کی سورت کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

چکیاں مردود را صورت بنگارند	یہ موبے و ہم صیغے اندازند
دریں حکمت و لم چیزے نذیر است	برائے حکمت و دیگر قید است
من این گویم حباں و را انقلاب است	وروش زند و در پیچ و تاب است
بذا اعداد و شمار خویش بگذر	یکے و رخورد نظر کن پیش بگذر
دریں عالم کہ جز را کل فزوں است	قیاس رازی و طوسی جنون است
زمانے با در سلو آشنا باش	وے با سانہ بکیں ہم نوا باش
و کیں از مست اہم شان گذر کن	مشو گم اندرین منزل، سفر کن

اُس مقلے کو داندہ بیش و کم را شناسد اندرون کاہن مریم را
جہاں چندہ چوں زیرِ نگیں کنن بگردوں ماہ و پردیں را کیس کنن
ولیکن حکمت دیگر بیاموز رہاں خود را ازیں مگر شب و روز

مقام تو ہر دہوں از روزگار است

قلب کن آں ہیں کو بے نیاز است

(ترجمہ: حکماء مڑے کی صورت دیکھتے ہیں۔ وہ مڑے کا عصب یا عیسیٰ کی نہ نہیں رکھتے۔ اس حکمت میں میٹرول نے کوئی چیز نہیں دیکھی ہے اور وہ کسی اور ہی حکمت کے لئے تڑپتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا انقلاب میں ہے۔ اُس کا دل زندہ ہے اور بیچ و تاب میں ہے۔ تو اپنے اعداد و شمار کو چھوڑ دے۔ ایک دفعہ قرآن اپنے اندر نظر کر دیتی اپنے آپ میں پوشیدہ صلاحیتوں پر غور کر۔ اور آگے بڑھتا جا۔ اس دنیا میں جس کا ایک حصہ کُل سے زیادہ ہے۔ رازمی اور غمسی کا قیاس جہوں ہے۔ کہیں تجھے چاہئے کہ اس سطر سے ہم آشنا ہو اور کہیں بیکن کا ہم نوا ہو۔ لیکن تو ان کے مقام سے گزر جا۔ تو اس منزل میں گم نہ مت ہو جابلکہ سفر کرتا رہ (یعنی آگے بڑھتا رہ) اُس مثل کے ساتھ جو کہن اور بیشی کو جانتا ہے اور کاہن اور سمندر کے اندر کے حالات جانتا ہے۔ اعداد و شمار کی دنیا کو تو زیرِ نگیں کر لے اور آسمان میں جاندار ستاروں کو مفتوح کر۔ لیکن تو دوسری حکمت سیکھ اور اپنے آپ کو اس دن اور رات کے کمرے آزاد کر دے۔ تیرا مقام اس زمانے سے باہر ہے۔ تو اس مشرق کی تلاش کر جس کا کوئی مغرب نہ ہو۔)

خودی یعنی اپنی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے

زمانے میں ۵

خودی تعویذِ حنظل کائنات است
خودش پر تو دانشِ حیات است
حیات از خوابِ خوش بیدار گردد
حدوش چون یکی بسیار گردد
نہ اُور اے نوردِ پاکشودے
نہ مار اے کثودِ اُود نمودے
ضمیرش بحرِ تاپید اکناس
دل ہر قطرہ موجِ بیقرارے
یکے بنگہ بخود چمیدنِ اُود
ز خاک پئے پہرِ بالیدنِ اُود
نہاں از دیدہ دارِ داؤد ہوسے
دامِ جستجوئے رنگِ بوسے
دوسوہ اندوہ در جستِ بغیرات
بآئینے کہ با خود در سیزات
خودی را پس بگر خاکِ حجابِ آست
طلوعِ اُود مثلِ آفتابِ آست
درونِ سینہ ما حنا و اُود
خودِ خاکِ ما از جوہرِ اُود
توئی گوئی مرا از من خمیدہ کن
چہ معنی دارِ اندر خود سفر کن
ترا گفتہ کہ ربِ جانِ حقِ پست
سفرِ خویش زادِ نجاتِ پست
ابہ ہر دُن بیک دمِ خطر اے
شایعے شاعی آفتابے
بہر دُن نقشِ ہر امید و بیکے
ز دُن چاکے بدیا چوں کیے
شگستنِ این طلمسہ بحرِ ویرا
ز انگشتے شگافیدنِ قمرِ آ
چنان باز آمدنِ از لامکانش
درونِ سینہ اود رکعتِ جانش

مشو غافل کہ تو اُود را امینی

چہ نادانی کہ سونے خود نہ بینی

(ترجمہ: خودی حنظل کائنات کا تعویذ ہے۔ اس کی ذات کا سب سے پہلا پُرؤ

زندگی ہے۔ زندگی اچھی خیند سے بیدار ہو جاتی ہے۔ اس کی اندرونی صلاحیتیں وحدانیت کی طرح مضبوط ہو جاتی ہیں۔ نہ اس میں بغیر ہماری خائش کے کشادگی ہے اور نہ میں بغیر اس کی کشادگی کے خائش ہے۔ اس کا ضمیر ایک بے پایاں سمندر ہے اور ہر قطرے کا دل ایک بے قرار موج کی طرح ہے۔ ایک دھند تو اس کے بیچ و تاب اور سوزش کو دیکھ قطروں سے اس کا شور و غوغا چھپا ہوا ہے۔ ہر لمحہ اسے رنگ و بو کی تلاش ہے۔ وہ اپنے اندرونی سوز کی وجہ سے جدوجہد میں مشغول ہے اس آئینے کی طرح جو اپنے آپ سے عریض تر ہے۔ خودی کے لئے خاک پیکر ایک پردہ ہے اس کا طلوع ہونا آفتاب کی مانند ہے اس کا مشرق ہمارے سینہ کے اندر ہے۔ تو مجھے کتا ہے کہ مجھے میرے ہی مطلق خبردار کرادے "اپنے آپ سے آگاہ ہو" کے کیا معنی ہیں؟ میں نے تجھے بتایا کہ جان اور جسم کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ تو اپنے آپ میں سفر کر اور دیکھ کہ میں کیا چیز ہے۔ اپنے آپ میں سفر کر ہے کہ بغیر ضروری ساز و سامان کے اس دنیا میں آنا اور اوج ثریا کو تسخیر کر لینا (یعنی اپنی ہی کوششوں اور جدوجہد سے طریق تک پہنچنا۔ یعنی *same road* شخصیتوں کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ ایک لمحہ کے اضطراب سے اور آفتاب کی ایک شعاع کا نظارہ کرنے سے قیامت بپا کر دینے کے مترادف ہے۔ ہر اُمید و بیم کے نقش کو پامال کرنے اور دریا میں کلیم کی طرح شگاف ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس بحر اور برکے ظلم کو توڑ دینے اور انگلی سے چاند میں شگاف ڈال دینے کے برابر ہے۔ لامکان سے اس طریقے سے واپس آنا ہے کہ سینہ میں وہ خود (یعنی اللہ تعالیٰ) ہو اور اس کی بغل میں جہان ہو۔ تو ماضی مت ہو، تو اس کا امین ہے۔ تو کیسا نادان ہے کہ اپنی طرف نہیں دیکھتا)

قوم کی امامت کے لئے ایک مرد تمام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اپنے خیالات

کا انکار کیا ہے۔ اس معاملے میں مغربی طرز کی جمہوریت کو اندھا دھند اپنالینے کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے اور مغربی طرز کی جمہوریت کے نقصان کو واضح کیا ہے ۔

مجر پاپاں کہ پایانے نہ داری	بپایاں تمار سی جانے نہ داری
نہ مارا پختہ پسنداری کہ خایم	بسر منزل تمام و ناتمام
بپایاں تمار سیدن زندگانی ست	سفر مارا حیات جاودانی ست
بہ خود پیچیم و بے تاب نہویم	کہ ما موبجیم و از قعر وجودیم
و نام خویش را اندر کیس باش	گریزاں از گماں سوئے یقین باش
تب و تاب محبت را فنا نیست	یقین و دید را نیز انہا نیست
کہاں زندگی و یاد بارات است	طرعیش رستن از بند جبات است

کسے کو "دید" عالم را امام است

من و تو ناتمامیم او تمام است

اگر او را خیالی در طلب خیز	اگر یابی بدانش در آدیز
بکار ملک و دی اور در لے است	کہ ما فریم و او صاحب نگاہے است
مشال آفتاب بسنگا ہے	دند از ہر بن مونس نگاہے
فرنگ آئین جمہوری سنا د است	دسن از گردن دیے کشاد است
خرد مجز کافری کافر گری نیست	فن از رنگ جز مردم دری نیست
گد ہے را گرد ہے در کین است	خدایش یا اگر کارش چنین است
زمن وہ اہل مغرب را پیاہے	کہ جمہور است تیغ بے نیاسے
چہ شمشیر کے کہ جانشناسی ستاند	تیز مسلم و کافر نداند

نماؤ در غلاب خود زمانے

نبرد جان خود و جانِ جمانے

(ترجمہ: تو اپنا کو تلاش نہ کر چو کہ تیری کوئی انتہا نہیں ہے۔ تو میں پہنچے
 نہ سمجھ چو کہ ہم خام ہیں ہر منزل میں ہم پہنچ گئے ہیں لیکن پھر بھی ہمارے مسلسل کی
 تمقین) انتہا تک نہ پہنچا ہی زندگی ہے (یعنی کسی انتہا پر اکتفا نہ کرنا ہی زندگی ہے)
 سفر ہمارے لئے حیات جاوداں ہے۔ ہم اپنے آپ سے بچ و تاب کھاتے ہیں اور غائب
 کے لئے بے تاب ہیں کہ ہم سوچ ہیں اور اپنے وجود کی گہرائیوں سے ہمارا تعلق ہے۔ ہر لمحہ
 اپنے آپ کو تسخیر کرنے کی فکر میں رہ (یعنی اپنی ہر صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کوشش
 کر) خلک و شہادت سے یقین کی طرف دوڑ۔ محبت کی تاب کو فنا نہیں ہے یقین
 اور نگاہ کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ زندگی کا کمال ذاب الہی کا دیدار ہے۔ اس کا طریقہ
 اطراف کی فیر سے آزاد ہو جانا ہے۔ روح شخص جس نے نگاہ و دور رس حاصل کر لی۔ وہ تمام ہے
 میں اور تو ناقص ہیں اور وہ تمام ہے۔ اگر تو اسے نہ پائے تو اس کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہو۔
 اور اگر تو اسے پائے تو تو اسے اپنے دامن میں باز نہ لے۔ ملک و دین کے کاموں میں
 دو راہ راست پر چلنے والا آدمی ہے کیونکہ ہم اندھے ہیں اور وہ صاحب نگاہ ہے۔
 صبح کے آفتاب کی مانند اس کے برابر بال کے کنارے سے ایک نگاہ اگ آتی ہے فرنگ
 نے جمہوری آئین کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس نے ایک دیو کی گردن سے رستہ کھول دیا ہے خود
 سوائے کاظمی کے اور کوئی کا فرنگی نہیں ہے۔ فرنگ کا فن سوائے لوگوں کو آزار
 پہنچانے کے کچھ نہیں ہے۔ ایک گردہ کے پیچھے دوسرا گردہ کی گمراہ لگائے بیٹھا ہے
 اگر اس کے معاملات ایسے ہی ہیں تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ میری طرف سے اہل فریب

کو یہ پیغام دو کہ جسور ایک بے نیام تلواری کی مانند ہے۔ وہ کسی تلوار ہے سلم اور کا فر میں فرق نہیں جانتی۔ وہ اپنے غلات میں کسی وقت بھی نہیں رہتی۔ وہ اپنی جان اور جہان کی جان کو فنا کر دیتی ہے۔

ملا تراقبال نے آزاد اقوام کے فنون کا بھی یہ نظیر غائر مطالعہ کیا ہے اور ان کا غلامی کے عہد کے فنون سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ بندگی کے فنون خواب و غرگوش کو مزید خوابیدہ کرتے کے باعث ہوتے ہیں اور آزاد اقوام کے فنون آزادی کی عظمت و سطوت کے منظر ہوتے ہیں۔

یک زماں بارفتگان صحبت گزین	صنعت آزاد مرداں ہم بہ ہیں
خیز و کار ایک دوسری رنگ	در نما چشمے اگر داری جسگر
خویش را از خود پروں آوردہ اند	ایں چنین خود را تماشا کردہ اند
سنگا با سنگا پیوستہ اند	روزگارے را با بے بستہ اند
دین او پختہ تر سازد ترا	در جہان دیگر اندازد ترا
دائے من از خویشان اندر حجاب	از فرات زندگی تا خوردہ آب
دائے من از یخ و برف برکنده	از مقام خویش دور انگندہ
محکمى ہا از یقین محکم است	دائے من شاخ یقینم جہنم است

در من آں نیروئے الا اللہ نیست

سجدہ اُم شایان ایں نگاہ نیست

یک نظر آں گوہر نابے بگر	تاج را در زیر متابے بگر
مرمرش زاب رواں گردندہ تر	یک دم آنجا از ابد پایندہ تر

عشق مردوں پاک و رنگیں چون بہشت می کشاید نغمہ باز سنگ و خشت
ہمتِ او آتشِ گروں گزشت از جہان چند و چون بیرون گزشت
زانکہ در گفتن نیاید آنچه دید

از ضمیر خود تقابے بر کشید

(ترجمہ: ایک لمحہ گزرتے ہوؤں کی صحبت ڈھونڈا اور آزاد مردوں کی صفت کو
ملاحظہ کر۔ تو اُسٹھ اور ایک اور سواری کے ماحول کو دیکھ۔ اگر تو جگر دکھتا ہے تو اُن؟
فکرِ حال وہ اپنے آپ کو اپنے آپ سے باہر لے آئے ہیں اور اس طرح اُٹھوں نے اپنی
عنائیں کی ہے۔ اُٹھوں نے تھروں کو تھروں سے جوڑا ہے اور ایک زمانے کو آب و تاب
دی ہے۔ اُس کا دیکھنا تجھے اور زیادہ پختہ بنا دیتا ہے اور تجھے ایک دوسری ہی دنیا
میں لے جاتا ہے۔ مجھ پر حیف ہو کہ میں اپنے آپ ہی سے شرم میں ہوں۔ زندگی کی
خیرات سے میں نے بانی نہیں پیا ہے۔ مجھ پر حیف ہو کہ میں مکمل طور پر اُگڑ چکا ہوں اور
اپنے مقام سے دور جا پڑا ہوں۔ میری مضبوطی یقینِ محکم کی وجہ سے ہے۔ حیف ہو مجھ پر کہ میری
یقین کی شاخ بے نم ہے۔ مجھ میں اللہ اللہ کی وہ طاقت نہیں ہے۔ میرا سجدہ اس دنگاہ کے
لائق نہیں ہے۔ ایک لحظہ تو اُس کو ہر تاب کو دیکھ۔ تاج کو چاندنی مات میں دیکھ۔ اُس کا
سنگِ مرصع اب دوں سے بھی زیادہ گردش والا ہے۔ وہاں کا بسیر کیا ہوا ایک لمحہ ابد سے بھی
نیا دہ پائیدہ تر ہے۔ مردوں کا عشق بہشت کی طرح پاک اور رنگیں ہے۔ یہ تھراور اینٹ سے نئے
بلند کرتا ہے۔ اُس کی بہت آسمان کے اُس پار تک پہنچی امداد اس امداد و شمار انھیں دہلی کی
دنیا سے آگے چلی گئی۔ اُس نے جو کچھ دیکھا وہ بتایا نہیں جاسکتا۔ اُس نے اپنے ضمیر پر سے نقاب
اُٹھایا +

تسخیر کائنات

اپنی تصنیف "جاوید نامہ" میں علامہ اقبالؒ نے ہمیں صحیح معنوں میں تسخیر کائنات کی دعوت دی ہے۔ اگر ہم آجکل کے واقعات دیکھیں اور یہ امر پیش نظر رکھیں کہ کس طرح بنی نوع انسان واقعتاً تسخیر کائنات کے عمل میں مصروف و سرگرم ہے تو ہمیں علامہ اقبالؒ کی وسعتِ نظر اور پیش بینی کی داد دینی پڑتی ہے۔ آج انسان ستاروں سے آگے اور جہازوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ چاند پر تو اپنے قدموں کے نقوش ثبت کر ہی چکا ہے اس کے علاوہ مریخ اور زہرہ تک بھی اپنے مشینوں کا رندے بھیج چکا ہے اور ان دنیاؤں کے بارے میں انتہائی قیمتی راز اپنے قبضے میں کر چکا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے شاہین بنے کی جو دعوت دی تھی وہ امریکہ کے شاہین نے تو چاند پر اتر کر کافی حد تک پوری کر دی ہے لیکن انسان اس امر کا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے جس قوم کو گمراہی کی کوشش میں اپنا خون پسینہ ایک کیا وہ ابھی تک مردہ ہے اور ترقی کی دوڑ میں ابھی بہت پیچھے ہے۔ چاند

یاستاروں پر کندھان تو کہا اسے تو ابھی سوٹ ایدرٹ تک پہنچنے کی بھی توفیق نہیں
 ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہماری قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کرنے کی ہمت
 عطا فرمائے تاکہ وہ علامہ اقبالؒ کی توقعات پوری کر سکے اور تسخیر کائنات میں اگر وہ
 پہل نہیں کر سکی تو کم از کم آئندہ کے لئے تو اس میدان میں پیچھے نہ رہے اور تہمت مردانہ
 کو کام میں لاتے ہوئے چاند اور ستاروں کو اپنی گرفت میں لائے۔

تو ازیں نہ آسماں ترسی ؟ مہترس از فرا خائے جہاں ترسی ؟ مہترس
 چشم بکشا ہر زمان و ہر مکاں ایں دو یک حال است از احوال جہاں
 پہنچ می داند کے درجائے فراخ می توان خود را نمودن شاخ شاخ

جو ہر ادنیٰ ہے یک ذوق نمود

ہم مقام دوست ایں جو ہر ہم دوست

فرد بخشت خاک از نوزایاں افروں شود روزے
 زمیں از کوکب تقدیر آو گروں شود روزے
 خیال آو کہ از سیل حوادث پرورش گیرد
 و گرداب سپہر نیلگوں بیرون شود روزے
 یکے در معنی آدم بنگ از ما چہ می پرسی
 ہنوز اندھ عبودیت می حسد مزدوں شود روزے
 چنان مزدوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمرنے
 کہ یزدوں را دل از تاثیر او پر خوں شود روزے

(ترجمہ: قرآن فرآسمانوں سے ڈرتا ہے؟ تو ان سے نہ ڈر۔ تو اس دُنیا کی فراخی سے ڈرتا ہے؟ اس سے نہ ڈر۔ تو زمان اور مکان پر آنکھ کھول کر نظر ڈال۔ یہ دُنیا ہماری زندگی کے حالات ہی کا حصہ ہیں۔ کیا کوئی شخص جانتا ہے کہ اس دینِ زمین میں اپنی پوری صلاحیت کے اظہار کا موقع موجود ہے۔ اس کا جو ہر معنی خاصیتِ خصوصی کیا ہے؟ اپنی نمائش کا ذوق و شوق ہے۔ یہ جو ہر ہر اُس کا مقام ہے اور یہی وہ نور ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی خاصیت ہے یا فطرت کا اصول ہے کہ وہ اپنی نمائش چاہتی ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی چاہئے کہ اسی خاصیت کا متبع کریں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کائناتوں کی نمائش کریں۔) اس مٹی مہرِ خاک کی ترقی ایک دینِ فرشتوں سے بھی بلند تر ہو جائے گی۔ زمین اپنی تقدیر کے ستارے کے باعث ایک دینِ آسمان کی صورت بن جائے گی۔ اُس کا خیال جو کہ حادثہ کے سیلاب سے پرورش پا رہا ہے، نیلے آسمان کے گرداب سے ایک دینِ باہر ہو جائے گا۔ تو ہم سے کیا پوچھتا ہے ایک مرتبہ آدم کے خیالات کے مضمین پر غور کر جو کہ ابھی اُس کی طبیعت میں بے تاب ہیں اور جو ایک دینِ موزوں ہو جائیں گے۔ یہ ہمارے راستے میں پڑا ہوا مضمون ایسا موزوں ہو گا کہ ایک دینِ یزداں کا دل اس کی تاثیر سے پُر خون ہو جائے گا۔)

معراج کے واقعہ کی علامہ اقبالؒ تفسیر یوں بیان کرتے ہیں کہ ترقی کے ذریعے میں ایک شیعہ تو اللہ تعالیٰ کی صفات کا متبع ہے لیکن ان صفات کے متبع تک ہی اپنی محنت، ہمت اور جذب و شوق کو محدود کر لیتا ہے کافی نہیں بلکہ *reager* خود ذات حق کا مالی مقام ہونا چاہئے اور وہ مالی مقام حاصل کر لیتا ہے معراج ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی برابری کے دعوے میں یا کسی طرح اس سے ٹکڑے ٹکڑے کے منتفی ہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں تسخیر کائنات کی دعوت دی ہے اور اُس کی صفات کا متبع کر کے

ہم بھی تسخیر کائنات کے مشکل کام کو آسان کر سکتے ہیں۔ ترقی کے ذیعے میں کسی ایک مرحلے پر تک جانا ہی کافی نہیں بلکہ اُس کی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے سبھی ناتمام میں مشغول رہنا ہی ہمارا تعلق ہونی چاہئے اور یہی ترقی و تعمیر کا راز ہے ۔

زندہ یا مردہ یا جاں بلب	از سر شاہد کسی شہادت را طلب
شاہدِ اولِ شہورِ خویش	خویش را دیدن بنورِ خویش
شاہدِ ثانیِ شہورِ دیگرے	خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہدِ ثالثِ شہورِ ذاتِ حق	خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیشِ ایں از بجائے استوار	حق و قائم چوں خدا خود را شمار
بر مقامِ خود رسیدنِ زندگی است	ذات را بے پردہ دیدنِ زندگی است
مرد مومن در زندانِ باصفا	مصطفیٰ را منی نشد الا بذات
چیتِ معراجِ آرزوئے شاہدے	امتحانِ روبروئے شاہدے
شاہدِ عادل کہ بے تصدیقِ اُد	زندگی مارا چو گلِ رازِ گد و بُر
ذوقِ از کفِ مدہ تاجے کہ ہست	پختہ گیر اند گروہ تاجے کہ ہست
تایبِ خود را ہر فردِ خوشتر است	پیشِ خورشیدِ آرمودِ خوشتر است
پیکرِ فرسودہ را دیگر تر است	امتحانِ خویش کن موجود باش

ایں چنیں موجود و محمود است و میں

دورِ نامہِ زندگی دورِ است و میں

(ترجمہ) تو زندہ ہے یا مردہ ہے یا جاں بلب ہے۔ اس امر کی تصدیق کے لئے

تین شاہدوں سے شہادت طلب کر۔ پہلا شاہد تو تیرا اپنا شہور ہے۔ تو اپنے آپ کو اپنے ہی

نور سے دیکھو۔ دوسرا شاہد کسی دوسرے کا شور ہے۔ قرآن ہے آپ کو کسی دوسرے کے نور سے پرکھو۔
 تیسرا شاہد ذات حق کا شور ہے قرآن ہے آپ کو ذات حق کے نور سے دیکھو۔ تو اگر اس نور
 کے سامنے سلامت رہے قرآن ہے آپ کو خدا کی طرح حق اور قائم شمار کرے۔ اپنے مقام تک
 پہنچ جانا ہی زندگی ہے۔ ذات حق کو بے پردہ دیکھنا ہی زندگی ہے۔ مرد مومن صرف ذات
 حق کی صفات کو اپنانے پر اکتفا نہیں کرتا۔ مصطفیٰ سوائے ذات حق کو حاصل کر لینے کے کسی اور
 بات پر راضی نہ ہوتے۔ معراج کیا ہے محبوب کو حاصل کرنے کی آرزو ہے۔ یہ محبوب کے سامنے
 ایک امتحان ہے۔ وہ ایسا عادل محبوب ہے کہ اس کی تصدیق کے بغیر ہمارے لئے زندگی ایسی
 ہی ہے جیسا کہ پھول بغیر رنگ و بو کے ہو۔ تو ایک ذرے کی مانند ہے اپنے ہاتھ سے وہ چمک
 نہ چھوڑ جو تجھ میں ہے بلکہ اُس چمک کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ اس چمک کو مزید ترقی دینا بہتر
 بات ہے۔ اپنے پرانے پیکر کو تو نئے سرے سے تراش۔ تو اپنا امتحان کر اور موجودہ اس
 قسم کا موجود اور محمود ہی بننا چاہئے ورنہ زندگی کی آگ محسن و صواں ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی اس نظم جاوید نامہ میں رجب حضرت رومی کے ہمراہ اور زہراؑ
 کی رہبری میں جو زمان و مکان کی روح ہے، اس نظامِ شمس کے مختلف سیاروں یعنی چاند،
 عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل اور ان سیاروں سے بھی پرے عالمِ بالا کی سیر کو حال
 لکھا ہے۔ جس طرح معراج مصطفیٰؐ ہمارے لئے نہ صرف حق تعالیٰ کی صفات کو اپنانے بلکہ خود
 ذات حق کے مقامِ عالی تک پہنچنے کی ایک کھلی دعوت ہے اسی طرح علامہ اقبالؒ کی یہ
 خیالی سیرِ افلاک ہمارے لئے ایک چیلنج ہے، ایک دعوتِ مجاہدہ ہے اور ہماری جہتوں
 کی ایک آزمائش ہے کہ ہم ان ستاروں پر کتنے ڈالیں اور تفسیرِ کائنات کا موجب بنیں۔
 تان چھوڑیں مگر ٹوٹش ہے کہ غیر علامہ اقبالؒ کے خیالِ شاہینِ بن گئے اور چاند اور

ستاروں پر کامیابی سے شبِ خون مارنے رہے لیکن انہیں کہ اقبال کی اپنی قلت ابھی اُس
مضمونِ عالی کو سموزوں کرنے ہی میں ملگی ہے اور ابھی اس کی تعمیر دیکھیں مزید کتنی دودھ
کاش ہم بھی ملامتِ اقبال کے ذوق و شوق اور جذبہٴ جنون سے سرشار ہونے اور گوش و ہوش
اور قلب و نظر کی صد سینوں کو مکمل طور پر اجاگر کر کے ترقی و تعمیر کی منزلیں استثنائی تیزی سے
لے کرنا شروع کر دیے۔ اس سیر کے دورانِ تصویر کائنات کے سلسلے میں اہم رموز مختلف مکالموں
کی صورت میں اُنہوں نے ہمیں کجائے اور اُنہیں اچھی طرح ہمارے ذہن نشین کرانے کے لئے
اُنہیں مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے ۔

جہاں دوست

عالم از رنگ است و بے رنگی است حق

چیت عالم ؛ چیت آدم ؛ چیت حق ؟

رومی

۲۰ می شمشیر و حق شمشیر زن عالم این شمشیر را سنگِ فتن

مشرق حق را دید و عالم را ندید عذب در عالم خزید از حق رمید

چشمِ برحق باز کران زندگی است خویش را بے پروہ و دین زندگی است

بندہٴ چوں از زندگی گیر و برات ہم خدا آں بندہٴ را گوید صلوات

ہر کہ از تقدیر خویش آگاہ نیست

خاکِ او با سوزِ جہاں مبرا نیست

(ترجمہ : جہاں دوست - دنیا رنگ کی وجہ سے ہے اور بے رنگی حق ہے - یعنی

حق کی نظروں میں رنگ و نسل کا امتیاز بے معنی ہے - عالم یعنی دنیا کیا ہے ؟ آدمی کیا ہے ؟ اور حق کیا ہے ؟

رومی - آدمی شمشیر ہے اور حق شمشیر زن ہے۔ عالم یعنی دنیا اس شمشیر کے لئے تیز کرنے والا پتھر ہے۔ مشرق نے حق کو دکھایا لیکن دنیا کو نہ دکھایا۔ مغرب نے دنیا کو دکھایا لیکن حق سے دور بھاگ گیا۔ حق کو آنکھ کھول کر دیکھنا زندگی ہے۔ اپنے آپ کو بے پردہ دیکھنا زندگی ہے۔ بندہ جب زندگی سے استفادہ کرتا ہے تو خدا بھی اس بندے کی غیریت چاہتا ہے۔ جو شخص اپنی تقدیر سے آگاہ نہیں ہے اُس کی خاک اپنی جان کے سوز کے ساتھ ہر آنکھ میں ہے ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

پیر ہندی اندکے دم در کشید	باز در من دید و بے گمان دید
گفت مرگ عقل ؟ گفتم ترک فکر	گفت مرگ قلب ؟ گفتم ترک ذکر
گفت تن ؟ گفتم کہ زاد از گردِ راه	گفت جان ؟ گفتم کہ رمزِ لا الہ
گفت آدم ؟ گفتم از اسرارِ دوست	گفت عالم ؟ گفتم از خود و بدست
گفت این علم و ہنر ؟ گفتم کہ پوست	گفت نجات چیست ؟ گفتم روئے دست
گفت دین مامیان ، گفتم شنید	گفت دینِ عارفان ؟ گفتم کہ وید

از کلام لذت جانِش فرزد

نکتہ ہائے دل نشیں بر من کشود

نُ تاسخن از عارف ہندی (جہاں دوست)

(۱)

ذات حق را نیست این عالمِ حجاب غولہ را حائل نگر و نقشِ آب

(۲)

زادون اندر عالمے دیگر خوش است تاشبا بے دیگرے آید بدست

(۳)

حق درائے مرگ دین زیت است بندہ چوں میرونی داند کہ جیت
گر چه با مرغان بے بال و پریم از خدا در علم مرگ افزوں تریم

(۴)

وقت؟ شیرینی بزم آمیخت رحمت مائے بقدر آمیخت
خالی از قمرش بزمین شمرودشت رحمت او این که گزلی در گذشت

(۵)

کافری مرگ است اسرارش نعلو کے سزو بامردہ نازی را جملو
مرد بوسن زخده و باخود بھنگ بر خود آفتد بھجو بر آبو پھنگ

(۶)

کافر بیدار دل پیش منم
پہ ز دیندارے کخفت اندر حرم

(۷)

چشم کورست اینکہ بیند تا صواب
ہیچکہ شب را نہ بسند آفتاب

(۸)

صحت گل و انداز سازد و زخمت آدمی از صحبت گل تیرہ بخت
داند از گل می پذیرد بیج و تاب تا کند سید شاعر آفتاب

(۹)

من بگل گفتم بگو اے سینہ چاک
چوں بگیری رنگ و بواز باد و حناک
گفت گل اے ہوشمند رفتہ ہوش
چوں پیائے گیری از برق خموش
جاں بہ تن مارا جذب این و آن
حذب تو پیدا و جذب ما من

(ترجمہ) : پیر ہندی نے تھوڑی دیر تک اپنا دم سادھا اور پھر اُس نے میری طرف دیکھا، اور بے تابانہ طریقے پر دیکھا۔ اُس نے پوچھا کہ عقل کی موت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ فکر کو ترک کر دینا۔ اُس نے پوچھا کہ قلب کی موت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ذکر کو ترک کر دینا۔ اُس نے کہا کہ جسم کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ راستے کی گرد سے پیدا ہوا ہے۔ اُس نے پوچھا کہ جان یعنی روح کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ لا الہ کی رمز ہے۔ اُس نے کہا کہ آدم کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ اُس کے یعنی اللہ کے بھیدوں میں سے ہے۔ اُس نے پوچھا کہ عالم کیا ہے؟ میں نے کہا کہ وہ تو ہمارے سامنے ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ علم و ہنر کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ بعض پوست ہے۔ اُس نے کہا کہ اس کا مغز کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ دوست کا چہرہ ہے یعنی ذات برحق ہے۔ اُس نے کہا کہ عامیوں کا دین کیا ہے؟ میں نے کہا کہ سنی سنائی باتیں۔ اُس نے کہا کہ عارفوں کا دین کیا ہے؟ میں نے کہا کہ خود کو کسی بھالی یعنی مشاہدہ کر دو چیز۔ میری باتوں سے اُس کی جان کی لذت بڑھی اور اُس نے دل نشیں کچھ پر داکے۔

عادت ہندی یعنی جہاں دوست کی طرف سے نوکھے :-

(۱)

ذاتِ حق کے لئے یہ دنیا حجاب کا باعث نہیں۔ نقشبِ آبِ غوطہ لگانے کی راہ میں
حائل نہیں ہوتا۔

(۲)

کسی دوسری دنیا میں پیدا ہونا اچھی بات ہے تاکہ میں کوئی اور شباب حاصل ہو۔

(۳)

حق، موت کے خوف سے ہٹ کر زندگی کا نام ہے اور زندگی کی اصلیت یہی ہے
بندہ جب مرنے جاتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ کیا ہے۔ اگرچہ ہم بے پال و پرگے پرندے ہیں
لیکن خدا سے ملے مرگ میں بڑھ کر ہیں۔

(۴)

وقت کیا ہے؟ ذہری ہوئی شیرینی ہے۔ رحمتِ عام میں قمر طرا ہوا ہے۔ تو شہرِ دشت
کو اُس کے قمر سے خالی دیکھتا ہے۔ اُس کی رحمت یہی ہے کہ اُس نے ہمیں بخشا ہوا ہے۔

(۵)

اے روشن منادِ کافری موت ہے۔ مردے کے ساتھ جا کر ناغازی کو کہاں زیب دیتا
ہے۔ مردِ مومن زندہ ہے اور اپنے ساتھ جگمگ میں مشغول رہتا ہے وہ اپنے ساتھ بہرِ پر کیا
رہتا ہے جیسا کہ چیتا پلنگ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مردِ مومن محنت محنت اور
اور جد مسلسل کے ذریعے اپنی جملہ صلاحیتوں کو بردے کا رلاسنے کے درپے
رہتا ہے۔

(۶)

نبت کے نزدیک ایک بیدار دل کا فراس ویندار سے بہتر ہے جو دم کے اندر رہ گیا۔

(۷)

وہ شخص اندھا ہے جو ہر چیز کا تاریک پہلو ہی دیکھتا ہے۔ دہرات کے کسی حصے میں بھی طلوع آفتاب کی نشانی نہیں دیکھتا۔

(۸)

مٹی کی صحبت دانے کو درخت بنا دیتی ہے لیکن (انوس ہے) کہ آدمی مٹی کی صحبت سے تاریک فیصلوں والا بنا ہوا ہے۔ دانہ مٹی سے پیچ و تاب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ آفتاب کی شعلہ کو شکار بنا آتا ہے۔

(۹)

میں نے پھول سے کہا کہ اے سینہ پاک تو ہوا اور خاک سے کس طرح رنگ اور بو حاصل کرتا ہے۔ پھول نے کہا کہ اے حواسِ باختر ہوشمند۔ جیسا کہ تو خاموش بھلی سے پیغام حاصل کرتا ہے۔ ہمارے جسموں میں روح الٰہی جذب ہوں سے ہے کہ تیرا جذبہ ظاہر ہے اور میرا جذبہ پوشیدہ ہے۔

ایک زندہ اور فعال قوم بننے کے لئے جس میں تتیر کائنات کی تمام قوتیں موجود ہوں۔ علامہ اقبالؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمیں مرد آزاد بننا چاہئے۔ ملا کے بانے ہوئے دین سے ہٹ کر ہمیں کرماءِ محل میں سرگرمی پیدا کرنی چاہئے۔ جعل و علم کے غلط استعمال سے پیدا کردہ بیم و رعبا کی کیفیت سے ہٹ کر عشق کے راستے پر گامزن ہو چاہئے جو امید و ہراس کے شلوک و شبہات سے بالاتر ہوتا ہے۔ غلش اور کاوش کے بغیر زندگی بیکار ہے اور زندگی کو اپنی

صلابتیں ہوتے کار لاکر اس طرح ستر بنانا چاہئے کہ آپ خود اپنی تقدیریں جائیں جذب
 شوق کے نشے میں چڑھیں ہم اس دنیا اور اس کائنات پر شیخوں مانتے ہیں تو کامیابی بہار
 قدم چومتی ہے ۔

مرد آزاد کے کوہ اند غیب و زشت	می گنجد روح اندر بہشت
جنتِ کلائے دُخو و غلام	جنتِ آزاد گاہِ سیرِ دوام
جنتِ مَلا غور و خواب و سرور	جنتِ عاشق تماشائے وجود
حشرِ لقا شقِ قبر و بانگِ مژدہ	عشقِ شہر انگیز خود صبحِ نشور
علمِ برہم و برہا و اردو اسس	عاشقانِ راسخ امید دے ہر اس
علمِ ترسان از جلالِ کائنات	عشقِ فرق اندر جمالِ کائنات
علمِ را بر رفتہ و حاضرِ نظر	عشقِ گرہِ آپسہ می آید نگر
عشقِ آزاد و عینور و نامبور	در تماشائے وجود آمدِ صبور
عشقِ ما از شکوہِ بابیگانہ است	گرچہ او را گریہ متناہ است
بے غلش با زلیستنِ نازیستن	باید آتشِ درتہ پا زلیستن
زمینِ اس گونہ تقدیرِ خودی است	از ہمیں نقدِ بر تعمیرِ خودی است
قدہ از شوقِ بے حد شکوہِ صر	گنجد اندر سینہ او نہ پھر

شوقِ چوں بر مالے شیخوں زند

آیناں را جادوئی می کنند

دوسرے جہاں : وہ آزاد مرد جو اچھے بُرے کی تیز دیکھتا ہے اس کی روح بہشت میں نہیں رہتی ۔
 ملا کی جنتِ شراب، حور اور غلام ہیں ۔ آزادوں کی جنتِ سیرِ دوام ہے ۔ ملا کی جنت کسنا رہنا

اور گنا ہے۔ عاشق کی جنت وجود کا تماشا ہے۔ 'ملا کا حشر قبر کا شوق ہوتا اور بانگِ سرو' ہے۔ عشقِ شریانیگز خود صبحِ نشور ہے۔ علمِ خوف اور ریاضیت پر بنیاد رکھتا ہے اور اس کے برعکس عشق کو اُمید اور ہر اس سے کوئی سروکار نہیں۔ علم کائنات کے جلال سے ڈرتا ہے جبکہ عشق کائنات کے جمال میں غرق ہوتا ہے۔ علم کی نظر گزشتہ چیزوں اور دورِ حاضر پر ہے جبکہ عشق آئندہ آنے والے واقعات کو دیکھتا ہے۔ عشق آزاد و غیور اور ناصبور ہوتا ہے اور وجود کے تھکاوٹ کی جبارت کرتا ہے۔ ہمارا عشق شکوؤں سے بیگانہ ہے اگرچہ اس کے لئے ایک گریہ مستانہ ہے۔ بغیر غلش کے جینا اور نہ جینا برابر ہے۔ جینا اس طرح چاہئے کہ گویا پاؤں کے نیچے آگ ہو۔ اس طرح جینا خودی کی تقدیر ہے اور اسی تقدیر سے خودی کی تعمیر ہے۔ ایک ذرہ جس میں بے حد شوق موجود ہو وہ سوج کے لئے بھی باعثِ رشک ہے اس کے سینے میں تو آسمان سما جاتے ہیں۔ شوقِ حیب دنیا پر شبِ خون مارتا ہے تو فانی لوگوں کو حیاتِ جاودا میں بخش دیتا ہے۔

ملکِ دلت سے غداری کرنے والوں سے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کے وجود کو دوزخ بھی قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ایسے اشخاص ملکِ دلت کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں اور ان کے جنم میں ہزاروں نئے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس شہیدِ آزاد می ملکِ دلت کے لئے حیاتِ جاودا کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی موت میں اسلام دوبارہ زندگی حاصل کرتا ہے۔ اور ملت دوبارہ اپنے عظیم تر مقاصد کی تکمیل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔

حجفراز بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم ، ننگِ دین سنگِ دین

نا قبول و نا اُمید و نا مراو ملتے از کارِ مشااں اندر فنا و

ملتے کو ہنر ہر ملت کشاو ملک و دنیاش از مقامِ خود فنا و

میں ندائی خطہ ہندوستان آن عزیز خاطر صاحب دلال
 خطہ ہر جلوہ آتش گیتی فروز در میان خاک و خون غلطہ ہنوز
 در گلش تخم نلامی را کہ کشت ایں جہ کہ داراں ارواح زشت
 ”در فضاے نیلگوں یک دم بایست
 تا مکافات عمل بینی کہ چیست“

گفتہ از مرگے کہ ساز و با محمد فلاں کہ ایں مرگے سے مرگ نام و دود
 مرد مومن خوابہ از میدان پاک آن دگر مرگے کہ برگیزد خاک
 آن دگر مرگ باستانے را و شوق آخریں بکسیر در جنگاہ شوق
 گر چه ہر مرگ است بر مومن شکر مرگے پور مرتضیٰ چیزے دگر
 جنگ شامان جہاں غارتگری است جنگ مومن سنت پغمبری است
 جنگ مومن چیست با ہجرت کئے دوست ترک عالم، اختیار کونے دوست
 آنکہ حرب شوق با اقوام گفت جنگ را رہبانے اسلام گفت
 کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
 کو بخون خود خریدہ ایں نکتہ را

(ترجمہ) : جعفر جنگال سے اور صادق دکن سے، جنگ آدم، جنگ دیں اور جنگ
 دامن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ نا قبول، نا اُمید اور نامراد ہیں۔ ایک پوری قوم ان کے
 کام کی وجہ سے فنا ہوئی ہے۔ ایک ایسی قوم جس نے بر قوم کے ہندوؤں کو توڑ دیا، اس کا
 ملک اور دین اپنے مقام سے گر گیا۔ تو ہندوستان کے خطہ کو نہیں جانتا۔ وہ صاحب دلال کے

دل کا عزیز۔ وہ خطہ جس کا ہر ملکہ دنیا کی رونق و وبال کرنے والا ہے ابھی تک خاک و خون میں غطایا و پچھا ہے۔ اس کی مٹی میں غلامی کا بیج کس نے بویا۔ یہ سب اُن ناپاک روحوں کی کارستانی ہے۔ اس نیلی نقاشی میں ایک لمحہ ٹھہرنا چاہئے کہ معلوم ہو اعلیٰ کا بدلہ کیا ملتا ہے۔

اس موت سے گزر جو قبر سے نیا پیدا کرتی ہے کیونکہ ایسی موت تو جانوروں کی موت کے برابر ہے۔ مرد مومن تو نیا دین پاک سے دوسری موت چاہتا ہے جو اُسے خاک سے اُٹھا دیتی ہے۔ وہ دوسری موت راہِ شوق کی انتہا ہے اور شوق کی جنگاہ میں آخری تکبیر ہے۔ اگرچہ مومن کے لئے یہ موت شکر ہے لیکن ابنِ مرتضیٰ کی موت ایک دوسری چیز ہے۔ شاہانِ جہاں کی جنگِ قاتلگرمی ہے لیکن مومن کی جنگِ پیغمبری کی شہادت ہے۔ مومن کی جنگ کیا ہے؟ دوست کی جانب ہجرت ہے۔ اس عالم کو ترک کرنا اور دوست کے کوچے کو اپنا لینا ہے۔ وہ کہ جس نے شوق کا موت تو مومن سے کہا۔ اُسٹوں نے جنگ کو اسلام کی رہبانی کا نام دیا۔ سوائے شہید کے کوئی اس نکتہ کو نہیں جانتا جس نے کہ خود اپنے خون سے اس نکتہ کو خریدیا۔

اسلامی روایات

اقبالؒ نے اپنی تصنیف ”ارمغانِ حجاز“ میں پتے پر سوز اور دلکش انداز میں اُن اسلامی روایات کی نشاندہی کی ہے جن کو اپنا کر قلبِ اسلامیہ فلک کی پہنائیں تک جاپہنچی اور افراد کے اُس کردار میں کو حیاں کیا جس کی بدولت اُنہوں نے اپنی انفرادی کامیابیوں کے علاوہ اپنی قوم کو ادبِ شریعت تک پہنچایا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے آجکل کی مسلم اقوم کی بے حسی پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ اُنہیں شرمِ دلائی ہے۔ اُنہیں ان کی پستی پر بے حجابانہ طریقہ پر لعن طعن کر کے اُنہیں غیرتِ دلائی ہے کہ وہ مسلمان ہونے کا بھرم رکھ لیں اور اپنے اسلام کی گزشتہ عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اُنہیں اسلامی روایات اور اسی کردارِ عمل کا معیار و دَکِیْن جس کے باعث اسلامی دنیا تمذیب و ترقی اور انسانیت کی آبرو بن گئی تھی۔

اقبالؒ کی زندگی میں اسلامی دنیا اور خصوصاً اسلامیانِ ہندِ غلامی کے قبر گناہی میں

ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہندوستان میں شکستِ تیموری کا چراغ بجھ چکا تھا اور مسلم ہند کی سلطنت و عظمت پارا پارا ہو چکی تھی۔ ترک عثمانی جس سے اسلامی دنیا کا جذباتی لگاؤ اب بھی باقی تھا، فرنگی سازشوں کی نذر ہو کر واما نہ و متزلزل تھا۔ دنیا سے عرب تو پہلے اپنے دورِ حجابِ ثانی میں پہنچ چکی تھی۔ مصری اور ترکستانی بھی محض اپنی عظمت رفتہ کا نشان بن کر رہ گئے تھے۔ غرض زلیں ہی زلیں تھا اور السوس تو یہ ہے کہ کارواں کے دل سے احساسِ یدیں بھی جاتا رہا تھا۔ علامہ اقبالؒ مسلمانِ عالم کو غیرتِ ولاتے ہوئے فرماتے ہیں :

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے کہو یا گیا کس طرح ترا جو ہر اوراک ؟
 کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق ؟ ہوتے نہیں کیوں توبہ سے سازوں کے جگر چاک ؟
 تو غارِ باطن کی خلافت کا سزاوار کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ غم و خاشاک ؟
 مہر و مر و انجم نہیں محکومِ توبہ کیوں ؟ کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں انداک ؟
 اب تک ہے رواں گرجِ لہو تیری رگوں سے نے گرمی انکار، نہ اندیشہِ ریاک !
 روشن تودہ ہوتی ہے جہاں میں نہیں ہوتی جس آنکھ کے پردوں میں نہیں سے نگہ پاک
 باقی نہ رہی تیری وہ آئینہٴ تمسیدی اسے کشتہٴ سلطانی و ملانی و پیری

غلامی کی لعنت ایسی لعنت ہے کہ غلامی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ یہ تو سبھی پہنچ ہو گا کہ غلامی ایسا دوزخ ہے کہ کیا اصل دوزخ اس کا مقابلہ کر سکتا ہو گا؟ لیکن جس پیرائے میں انھوں نے اس لطیف نکتے کی وضاحت کی ہے وہ خود انہی کا حصہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :

قبر — (اپنے مردہ سے)

آہِ عالم ! تو جہاں میں بندہٴ محکومِ خدا میں نہ سمجھی تھی کہ یہ کیوں خاکِ میری موزناک
 تیری میت سے مری تادیکھیاں تار یک تر تیری میت سے زمیں کا پردہٴ ناموسِ پاک

انھیں محکوم کی میت سے سو بار مسح
اے اسرائیل! اے خدائے کائنات! بے جاہن پاک
ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

نے نصیب مارو گزندہ نے نصیب دام و دو
ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگ ابد
بانگ اسرائیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
روح سے تھا زندگی میں ہی تھی جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوش محمد

اسی کتاب میں ایک اور جگہ غلامی اور دوزخ کا مقابلہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

دوزخ و اعط کا فرگے گفت
حدیث خوشتر از بے کافرے گفت
ندانم آن غلام احوال خود را
کہ دوزخ را مقامے دیگرے گفت

(ترجمہ : دوزخ سے متعلق ایک واعظ کا فرگر (کافر بنانے والا واعظ) نے کوئی بات

کہی۔ لیکن اس بات سے سہرات خود کافر نے کہی اور وہ یہ تھی کہ وہ غلام اپنے احوال کو
نہیں چھپاتا جو کہتا ہے کہ دوزخ (غلامی کے علاوہ) کوئی اور مقام ہے)

کس زبردست طریقے سے غلامی کا بھانڈا پھوٹا ہے اور ملت اسلامیہ کو غلامی کی قید

بند سے آزاد ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اس مباحثہ میں ایک زبردست لطیف نکتہ قابل

غور یہ ہے کہ واعظ کو کافر گر کہا ہے۔ جیسے اکثر و بیشتر ملکوں کی سیاست میں بادشاہ گروں

کے بارے میں سنا جاتا ہے اسی نسبت سے واعظ پر کافر گر ہونے کی چوٹ کرنا اقبال کا ہی

حق ہے۔ وہ بجا طور پر یہ تصور کرتے ہیں کہ ہمارے واعظ قرآن کی جس طور پر تفسیر ہمارے

سامنے پیش کرتے ہیں اس سے مسلمانوں کا کردار و عمل بیدار نہیں ہوتا بلکہ وہ اس دُوب کی

عمومیوں کو الگی دنیا کی بشت کی آسائشی خادانیوں کے اسباب ہی بتا کر اور مسلمانوں کو

اپنی تقدیر کے چکر میں محو کر کے خوابِ فرگوش میں سُلا کر ہی دم لیتے ہیں۔ خدا ہر جہے کہ ایسے

وامظہ و ملا اور صفوی صحیح معنوں میں مسلمان اور موسیٰ کو پیدا کر ہی نہیں سکے جن کی حیثیت سے کہہ بھی رائی بن جائیں البتہ ان سے کافروں کی ایک فرج ظفر موج تو ضرور تیار ہو جائے گی۔ جو کھلانے کو مسلمان ہوں گے لیکن ان میں صفات جملہ کافرانہ ہوں گی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

نہن ہر صفوی و ملا سلائے کہ پیغام خدا گفتند مارا

دلے تاویل شان در حیرت انداختا خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

(ترجمہ: میری طرف سے صفوی و ملا کو سلام پہنچے کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہمیں سنایا۔ لیکن جو تفسیر قرآن اُنہوں نے بیان کی ہے اُس سے تو اللہ تعالیٰ۔ جبرئیل اور آنحضرت صلعم بھی حیرت و استعجاب میں ہیں۔)

ایک اور جگہ اس حالت زار کا تاثر کہتے ہیں کہ ہم قرآن حکیم کی روح کو چھڑ چکے ہیں اور اس کی حکمت سے استفادہ کرنے کی بجائے بیسودہ توہمات میں پڑ گئے ہیں۔ خلا خطہ ہوا

نہ بندہ صفوی و ملا اسیری حیات از حکمت قرآن نگیری

بآیاتش ترا کا رہے جزا بنیست کہ از یسین او آساں ہمیری

(ترجمہ: تو صفوی و ملا کی قید میں گرفتار ہو چکا ہے اور تو قرآن کی حکمت سے زندگی کی توانائی حاصل نہیں کرتا۔ قرآن کی آیتوں سے تجھے سوائے اس کے اور کوئی سرکار نہیں کہ اس کی سورت یسین کے طفیل تو آسانی سے مر سکے)

برہمن از بتان طاق خود آراست

تو قرآن را سہر طاقے نہادی

(ترجمہ: برہمن نے اپنے اُطان کو بتوں سے سجایا اور تو نے قرآن کو بلائے طاق

دکھ دیا)

اسی سلسلے میں مسلمانوں کو متعین کہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

ز قرائن پیش خود آئینہ آویز و گر گل گشتہ از خویش بگریز

ترانہ سے بہتہ کر دابر خود را قیامت ہائے پیش را برانگیز

(ترجمہ: اپنے سامنے قرآن کی اہل تعلیمات کا (مُلا کا نہیں) آئینہ شکالے، تو بدراہ

ہو چکا ہے۔ اپنی صفات سے بھاگ۔ تو اپنے کردار کا خود محاسبہ کر اور آنے والی قیامتوں

کو بدل ڈال)۔

علامہ اقبالؒ نے خافقاہیت، رہبانیت اور مزار پرستی کی بہت سخت مذمت کی ہے اور

ہمارے مذموم حالت اور پرستی کی انتہا کی بہت بڑی وجہ قرار دیا ہے۔ اسلام ہمیں یہ ہرگز

نہیں سکھاتا کہ ہم دنیا کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تنگ دودھ کرنے کی بجائے اپنے راستے

کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی بجائے اور ترقی کے رستے پر متب و تاب سے آگے بڑھنے کی بجائے

دنیا کی تلخ حقیقتوں سے فرار اختیار کر لیں اور دنیا کو تیاگ کر رہبانیت اور خانقاہیت میں

گوشہ یافتہ و صوفیہ بنیں۔ یہ تو محکوم اور پسماندہ قوموں کا ہی خاصہ ہے۔ اسی طرز پر وہ مجاہد

جو کسی مزار پر بیٹھ کر اُس بزرگ کی صحیح تعلیمات کا پرچار کرنے کی بجائے اور اُس مزار

کے طفیل کسی سکول یا ہسپتال یا اسی قسم کا رفا و عامہ کا کام کرنے کی بجائے (جیسا کہ

اور حاضر میں عیسائی مشنریوں کا دستور ہے) اُس مزار کو روزی گمانے کا ہی ایک ذریعہ

بنالیتے ہیں اور وہاں فیس و سرود کی محفلیں گرم کرنے ہی کو عین اسلام سمجھتے ہیں تو اس سے

بڑھ کر مسلمان قوم کی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو ۱۔

مریدے خود شناسے پختہ کارے یہ چہرے گفت حرفے میث و اداے

برگ ناتمائے جاں سپردن گر عشق روزی از خاک مزارے

(ایک اپنے آپ کو پہچانتے والے اور پختہ کار مرید نے اپنے پیسے کیا دکھتی ہوئی بات کسی کو کسی مزار کی خاک سے روزی حاصل کرنا اپنے آپ کو ایک لامتناہی موت کے سپرد کرنے کے برابر ہے)

ابلیس کی مجلس شوریٰ کے اجلاس کا منظر دکھاتے ہوئے ابلیس کی تفسیر کے دوران اس سلسلے میں اس کی خواہشات کا کس خوبی سے نقشہ کھینچا ہے ۔

قوڑ ڈالیں جس کی تکبیر میں طلبِ بدشش جبات

جو نہ روشن اُس خدا اندیش کی تاریک سات

ابن مریم مر گیا یا زندہ جاوید ہے ؟

ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا میں ذات ؟

آنے والے سے میرے ناصرِ معبود ہے

یا معبود جس میں ہوں نرِ زندہ مریم کے صفات

ہیں کلامِ اللہ کے الفاظِ حادث یا قدیم

اُمتِ مروجہ کی ہے کس غضبے میں نجات

کہا مسلمان کے لئے کافی نہیں اس دور میں

یہ اہلیات کے ترشے ہوئے لات و منات ؟

تم لے بیگانہ رکھو سالیم رکرو دار سے

تا بساطِ زندگی میں اس کے سرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک ہے مومن غلام

چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ مہمان بے ثبات

ہے وہی شعور و تصرف اُس کے حق میں خوب تر
 جو چھپا دے اُس کی آنکھوں سے تھما لئے حیات
 ہر نفس ڈرتا ہوں اُس اُقت کی بیداری سے ہیں
 ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
 مست رکھو نوکر و ظہر صبح کا می میں اے
 پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اے

پہا مذہبوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ تقدیر پرستی کے مرض میں مبتلا ہوتی ہیں۔
 اُن کے افراد اپنی محبتوں اور عمل پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ تقدیر کے جاگنے ہی کے منتظر رہتے ہیں
 اور اللہ تعالیٰ سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ فی سبیل اللہ اُنہیں اس دنیا کی دولت میں سے
 کچھ بخش دے۔ یہ تقدیر پرستی ایسی انہوں ہے جس کے فتنے نے عصر حاضر کے مسلمانوں کو تباہ
 برباد کر دیا ہے۔ عام ملاحظے کی بات ہے کہ معاشرہ میں ہمارے افراد کیا جیسے بوڑھے
 کیا جوان اور کیا عورتیں اور بچے سبھی مقتدر کے صدقے اپنے حقے کا انتظار کرتے ہیں اور
 تو اور حد تو یہ ہے کہ اچھے بچے پڑھے لکھے لوگ بھی مقتدر اور سامان کی گردش میں ہی اپنی
 کامیابی ڈھونڈتے ہیں۔ خدا کرے اس قوم کے افراد جلد یہ محسوس کر سکیں کہ ان کی تقدیریں
 اُن کے جنم سے بھی پہلے لکھی نہیں جا چکیں بلکہ خود ان کا عمل ہی ان کی تقدیر ہے۔ اگر وہ باطل
 ہوں گے اور بلند جذبے کے حامل ہوں گے تو ان کی تقدیر کا ستارہ بھی اونچا ہوگا اور اگر وہ بے عمل
 ہوں گے اور دون جتنی اُن کا خاصہ ہوگی تو اُن کی تقدیر بھی مردہ ہوگی۔ علامہ اقبالؒ کے کلام سے
 اس سلسلے میں اقتباسات سنئے:

خدا آں تھے را سردری داد کہ تقدیرش بدست خویش نوشت

ہو آں قمت سروکار سے نہ دارو کہ دہقانیش برائے دیگر گشت
 (ترجمہ: خدانے اس قوم کو بادشاہت دی جس نے اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھ سے نکھا۔
 اُس نے ایسی قوم سے کوئی سروکار نہ رکھا جس کے دہقان نے دوسروں کے لئے کاشتکاری کی۔
 ہر وہا گفت بامیں را بہب پیر کہ دارم نکتہ از من فرا گیسو
 کند ہر قوم پیدا مرگ خود را ترا تقدیر و مارا گشت تدبیر
 (ترجمہ: ایک بوڑھے راہب نے مجھ سے شہر روم میں کہا کہ میں ایک چنے کی بات کہتا
 ہوں مجھ سے سُن لے کہ ہر قوم خود ہی اپنی موت کو پیدا کرتی ہے۔ تجھے تقدیر نے اور مجھے
 تدبیر نے مار دیا۔)

میشے ہر پاکانِ حرم ہست میشے ہر اربابِ ہم ہست
 بگو ہندی مسلمان را کہ خوش باش میشے فی سبیل اللہ ہم ہست
 (ترجمہ: ایک ہشت حرم کے پاکباندوں کے لئے ہے اور ایک ہشت ہمت والے لوگوں
 کے لئے ہے۔ ہندی مسلمان سے کہہ دو کہ خوش رہے کیونکہ ایک ہشت فی سبیل اللہ بھی ہے)

المیس

میں نے ناواروں کو کھٹلایا سبق تقدیر کا
 کون کر سکتا ہے اُس کی آتش سوزاں کو نہ
 جس نے منعم کو دیا سراپہ داری کا جنوں
 جس کے ہنگاموں میں المیس کا سوز و دل
 جس کی شاخیں ہوں ہماری آبِ یاس سے بلند
 کون کر سکتا ہے اس تخیلِ کمں کو سرنگوں؟

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے قمت کے مستدر کا بتا رہا

مردم رہا دولت دریا سے وہ خواہم کہ تائیں جو صحبت ساحل سے کنارا

ترے دریا میں طرزاں کیوں نہیں ہے؟ خودی تیری مسلمان کیوں نہیں ہے؟
جبٹ ہے مشکوہ تقدیر یزدان تو خود مقتدر یزدان کیوں نہیں ہے؟

خبر نہیں کیا ہے نام اُس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلمان بدل کے تقدیر کا بہانہ
مری اسیری پہ شاربِ گل نے یہ کہہ کے سیاد کو رُلایا
کہ ایسے پُرسورِ فتنہ خواں کا گراں نہ تھا مجددِ آشیانہ

علامہ اقبالؒ نے خودی اور خود آگاہی پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ خودی کو انھوں نے ایک تو خود داری کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور مردِ مسلمان کو چاہئے کہ خواہ مخواہ، چھوٹی موٹی چیز کے لئے غیروں کے سامنے خواہ مخواہ حقیر نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے خودی کا لفظ خود اعتمادی اور خود آگاہی کے معنوں میں ہم سمجھتے ہیں کہ کافی زیادہ استعمال کیا ہے۔ یعنی مسلمان کو چاہئے کہ خود اپنی کوششوں اور صلاحیتوں پر اعتماد رکھے۔ خواہ مخواہ کے احساسِ کمتری کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ اپنے آپ کو سمجھانے ہوئے اپنے آپ سے اونچا مقتصدِ حیات اپنے سامنے رکھے اور اسے حاصل کرنے کے لئے جبرِ زورِ کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو اپنے آپ کا ہدف کا باشندہ ہو یا مشرق کا، صلاحیتوں اور قوتوں کا، ایک لامتناہی سلسلہِ دوست کیا ہوتا ہے۔ اگر ہم ان کو اپنے عزمِ مصمم اور محنت سے بردنے کا راستہ لائیں تو وہ اور بھی آجاکر ہو جاتی

ہیں اور راستے کی ہر مشکل کو تنکے کی طرح ہساکر لے جاتی ہیں۔ البتہ اگر ہم انہیں کام میں لانے سے گریز کریں تو ظاہر ہے کہ وہ مسامحتیں رنگ آلودہ جاتی ہیں۔ خودی یعنی خودداری اور خودی یعنی خود اعتمادی اور خود آگاہی کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے کلام سے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحان ثبات
خودی ہے زندہ تو دیا ہے بیکرا نہ ترا ترے فراق میں مضطر ہے سوج نیل و فرات
خودی ہے مرد تو مانند گاہ پیش نسیم خودی ہے زندہ تو سلطان جہل موجودات
خود آگماں کو ازیں خاک اہل ہوں جستند
طلسم مہر و سپرد ستارہ لبکستند

خودی مرد خود آگاہ کا جمال و جلال کہ یہ کتاب ہے ، باقی تمام تفسیریں
حکوم و عید کا قائل نہیں ہوں میں لیکن قبول حق ہیں فقط مرد حق کی تجبیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے دُرائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

کبھی دریا سے شل موج ابھر کر کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گز کر مست ام اپنی خودی کا فاش تر کر

چرخے سے گذشت از گفتگو با ز خاک او برود آرزو با
خودی از آرزو شمشیر گردو دم اور رنگ با بُرد ز بُر با

(ترجمہ: جب کوئی قوم محض گفتگو سے دور سے آگے نکل جاتی ہے (یعنی علم کے دور میں داخل ہو جاتی ہے) تو اس کی خاک سے آندھیں اگتی ہیں۔ خودی آندھ کے باعث شمشیرِ بانی ہے اور اُس کا دھارا رنگوں کو خوشبودں سے کاٹ دیتا ہے۔)

دلے چوں صحبت گُل میں پذیرد ہما ندم لذتِ خواہش بغیرد
 شود بیدار چوں "من" آفریند چوں "من" محکوم تنِ گردِ بیدرد

(ترجمہ: جب دلِ مستی کی صحبت اختیار کر لیتا ہے تو اُس کی طرح خواہیدگی کی لذت حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جب اُس میں "آپنا پن" بیدار ہو جاتا ہے تو وہ تخلیقات کا حامل ہو جاتا ہے اور جب اُس کا آپنا پن "جسم کا محکوم" ہو جاتا ہے تو وہ مر جاتا ہے)

مشکل پندی

اقبالؒ نے اپنی تصانیف میں اور خصوصاً "بالِ جبرلی" میں اپنی مشکل پند طبیعت کا برملا اظہار کیا ہے۔ اُنہوں نے جگہ جگہ قوم کو سخت کوشی اور زہر کی کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کرنے اور اُن پر قابو پانے کی تلقین کی ہے۔ اس جگہ میں یہ وساحت کو دینا ضروری ہے کہ اقبالؒ نے جہاں جہاں قوم کو بحیثیت مجموعی اور فرداً فرداً یہ وعادی ہے کہ ان کی مشکلات کبھی ختم نہ ہوں تو اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ وہ قوم کا بھلا نہیں چاہتے یا یہ کہ وہ قوم کی راہ میں مشکلات کے کانٹے بونا چاہتے ہیں بلکہ اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم ترقی کی راہ کی مشکلات سے نہ گھبرائیں اور ہمت باجملے کی بجائے اُن پر قابو پانے کی ہر ممکن ترکیب اپنی بلند ہمتی اور سخت کوشی کی عادات کو بروئے لاتے ہوئے آزمائیں اور اس طرح اُن پر قابو پاتے ہوئے ترقی کے راستے پر متواتر چلتے ہی رہیں۔ یعنی ترقی کے راستے کا ایکٹ نہ ملے کر کے یہ نہ سمجھیں کہ ہم منزلِ مقصود تک پہنچ گئے ہیں بلکہ مردانہ دار آگے بڑھتے ہوئے

مہتر سے مہتر منزل کے حصول کے لئے ہمیشہ کوشاں رہیں۔ اسی طرح جہاں انہوں نے بار بار کوششیں ناتمام کو سراہا ہے اُس سے یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ایسی کوشش جو پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے یا جس سے مقصد حاصل نہ ہو وہی اچھی کوشش ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کوشش مسلسل جاری رہتی چاہئے۔ پہلے تو ہم ایک اونچے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی پوری کوشش کریں لیکن اُس مقصد کے حصول کے بعد یہ کافی نہیں کہ ہم مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں اور مزید کوششیں ختم کر دیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ ایک اونچے مقصد کو حاصل کرنے کے بعد ہم اُس سے بھی زیادہ اونچا مقصد حاصل کرنے کے لئے کمر بستہ بنادیں اور اس کے لئے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں۔ اسی طرح جب یہ مقصد بھی حاصل ہو جائے تو پھر اس سے بھی زیادہ اونچے مقصد کے حصول کے لئے سر دھڑکی بازی لگا دیں۔ تو یہ ہے "کوششیں ناتمام" جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے دعا کی ہے کہ یہ مقصد ہماری قوم اور ہمارے افراد کے سامنے ہمیشہ رہے۔ یعنی ہم زیادہ سے زیادہ ترقی کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیں راستے کی ہر مشکل پر قابو پانے کے لئے ایک جلد مسلسل کی توفیق عنایت کرے۔

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں	وہ گلستاں کہ جہاں گمات میں نہ ہر صیفا
مقام شوق رتے قدیموں کے بس نہیں	انہیں کا کام ہے یہ جن کے تھیلے میں زیڑا

جوانوں کو مری آؤ سحر دے	پھر ان شبیں بچوں بال و پر دے
خدا یا آرزو میری یہی ہے	مرا فوہ بصیرت عام کر دے

سرمجہ کو پہلے زندگی جاوداں ملے	پھر ذوق و شوق دیکھ دلی بے قرار کا
--------------------------------	-----------------------------------

کاشادہ دے کہ جس کی کشک لاندوال ہو یارب وہ درد جس کی کشک لاندوال ہو
 ملازم اقبال نے اکثر و بیشتر جگہ قوم کو اس کی طویل غلامی، بے بسی اور بے خبرتی
 پر محنت کست کہا ہے اس سے بھی اُن کی مراد یہ ہے کہ ہماری غیرت جوش مارے اور ہم
 خواب خرگوش سے بیدار ہو کر غلامی کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکیں۔ اس سے یہ مطلب
 ہرگز نہیں کہ ہماری حوصلہ شکنی ہو یا اُن کے نزدیک ہم اتنے حقیر ہیں کہ ترقی کے قابل ہی نہیں
 حاضر ہوا میں شیخ بستہ کی محد پر وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
 کی عرض یہ میں نے کھٹا فقر مجھ کو ہاتھیں مری بنا ہیں ولیکن نہیں بیدار
 آئی یہ سدا سلسلہ فقر موابند ہیں اہل نظر کشہ پنجاب سے بیزاد
 عادت کا شکوہ نہیں دہ خطہ کہ جس سے پیدا کھٹا فقر سے ہو طرہ دستار
 باقی کلمہ حق ہی سے اتحاد لولہ حق کھڑوں نے چڑھایا نشہ خدمت سرکار
 اسی کے ساتھ ملازم اقبال نے اکثر و بیشتر جگہ یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ
 ہر کمالے راندوالے و ہر زوالے راکمالے۔ اگر ہم آجکل زوال کے اعتقاد غار میں گھرے
 ہوئے ہیں تو اس سے ناامید و مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر ہم غم کے ساتھ ساتھ
 قلب و نظر کی تمام قوتوں کو بروئے کار لائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم زوال کی منزل کے بعد ترقی
 طور پر عروج کی طرف دوبارہ پُر عزم طریقے پر روانہ نہ ہو جائیں۔ اُمحسوں نے حقیقت
 بھی بار بار آشکار کی ہے کہ ہر نئی تعمیر سے پہلے پرانی عمارت کی مکمل تخریب ضروری ہے۔
 اور یہی فطرت کا اصول ہے۔ لہذا اگر ہم تخریب مکمل تک جا پہنچتے ہیں تو اس سے ناامیدی
 اور یاس کی بھی انتہا اپنے اوپر پھاری کر لینے کی ہرگز ضرورت نہیں بلکہ پُر عزم طریقے پر تعمیر نو
 کے لئے پوری محنت کے ساتھ کام میں لگ جانا چاہئے۔

وہی دیرینہ پیادہ ہی! وہی ناممکن دل کی
 نہیں ہے ناامید اقبال! حتیٰ گشتِ دیران سے
 علاج اس کا وہی آبِ نشاۃ النکیز ہے ساقی
 ذرا تم ہو تو یہ میٹھی ابھی نہ خیز ہے ساقی

لا بھر اک بار وہی بادہ و جام لے ساقی
 تین سو سال سے ہیں ہند کے گئے خانے بند
 ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی
 اب مناسب ہے ترانہ فیض جو جام اے ساقی

مرد ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
 خبر ملے خدا یا بن مجرور سے مجھے
 وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راد میں ہے
 فرنگِ رگبذِ سیل بے پناہ میں ہے
 تلاش اس کی شاد میں کر نصیب اپنا
 جہانِ تازہ مری آہ بھنگاؤ میں ہے

مرد ستارہ سے بھی آگے مقام پہل کرنا نہ کہتے ہیں علامہ اقبال نے مرد مومن
 بننے کی تعین کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کہنے کو تو ہم مسلمان ہیں۔ نثار، روزِ راج اور نہ کوہ کے بھی
 پابند ہیں یکس در پہل کا فرہیں چمکے یہ رسوم تو ہم سرف و دکھاؤ کے لئے انا کر دیتے ہیں۔ اُن
 کے ذریعے وہ کسی تعلیمات کو ہم یکسر بوجھتے ہیں اور اُن کے تشنہ نظر کے ہم کا فوں سے بھی
 جگہ گزرتے ہیں۔ اعلیٰ تر ایک استثنائی قوی اور متحرک مذہب ہے اور قدم قدم پر عمل کی
 تعلیمی کتاب لیکن ہم ہیں کہ صرف قرآن کو آرائش یا زیادہ سے زیادہ اس کی تلاوت، بغیر ترتیب
 کے، پر اکتفا کرتے ہیں جبکہ اس پر طرہ و یہ کہ ہمارے بعض مفسرین اس کی من مانی تعبیر یہ پیش
 کرتے ہیں۔ مومن مسلمان اور کافر مسلمان کا فرق واضح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ
 تو فربہ مسلمان تو نہ ہیں نہ فہری مومن ہے تو کتابِ فہری میں بھی مشابہی

کا ذرے تو شمشیر پہ کرتا ہے مہر دے مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
 کا ذرے تو بے تابع تقدیر مسلمان مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الہی
 میں نے تو کیا پردہ اسرار کو بھی چاک دیرینہ ہے تیرا مریض کو رہ گیا ہی

بہن سے تجھ کو امیدیں خدا سے (امیدی مجھے بتا تو سہی اور کافی کیا ہے
 فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا نہ ہو نگاہ میں شغلی تو دلبری کیا ہے
 کسے نہیں ہے تنائے سرور ہی لیکن خودی کی موت ہو جس میں وہ سرور کیا ہے

علامہ اقبالؒ کا مرد مومن "وہ جہلاً و صاف اپنے آپ میں رکھتا ہے جن کی تکلیفیں
 انہوں نے اپنی تصانیف میں کی ہے۔ ان سب اوصاف میں سب سے زیادہ علامہ اقبالؒ نے
 خودی پر زور دیا ہے جس سے زیادہ تر اُن کی مراد خود اعتمادی اور اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر
 بردئے کار لانے کا وصف ہے۔ اُن کا تحریر یہ ہے کہ پے در پے ناکامیوں اور مختلف محاذوں
 پر شکستوں کے بعد ہم اس قدر پست حجت اور دل برداشتہ ہو چکے ہیں کہ ہم اپنے آپ پر سے
 مکمل طور پر اعتماد کھینچ لیں اور یہ فرض کر چکے ہیں کہ ہم میں کسی بھی بلند مقصد کام کرنے کی
 صلاحیت ہی باقی نہیں رہی حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ گزشتہ ناکامیوں سے بددل ہونا تو کفر
 ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ہمارے اعتماد کو بحال کرنے کے لئے بار بار خودی کو بیدار کرنے پر زور
 دیا ہے اور ہمیں یاد دلایا ہے کہ اگر ہم اپنے آپ کو بھول نہ جائیں اور اپنی صلاحیتوں کو
 بردئے کار لاتے ہوئے کمر محنت کو باندھ لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بلند سے بلند مقصد کو بھی
 اپنے واپس گزشتہ میں نہ پائیں ۵

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ سبجگا ہی
کہ خودی کے ماروں کا ہے مقامِ پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو رومیاہی
تو ہمارا ہے شکا ہی ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہاں مرث و ماہی

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آج جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں
خودی میں ڈوبتے ہیں پہرہ بھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلہ سرور بیچ کا رہ نہیں
ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

علامہ اقبالؒ نے جگہ جگہ فقر کے صفت پر بھی زور دیا ہے۔ بعض نئے نئے پڑھنے والے
علامہ اقبالؒ کے کلام کا جب تک میں مطالعہ نہ کریں غلط مطلب اخذ کر لیتے ہیں مثلاً
فقر سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی گداؤں کا کارہ لے کر فقیری یعنی گداگری کا پیشہ یا غناقت
اختیار کر لے بلکہ فقر سے یہ مراد ہے کہ اُس میں استغنا ہو اور وہ خواہ مخواہ خدمت سرکار کے
فٹے میں مست نہ ہو اور علامہ اقبالؒ کے زمانے میں تو ہم تھے بھی غیروں کی غلامی کے شکنجوں
میں جکڑے ہوئے۔ سو ہمیں انھوں نے آگسٹا کو ہم حکمرانوں کے کارہ لیس نہ نہیں بلکہ اپنی
عزت و حیثیت قائم رکھتے ہوئے اپنی محنت، اپنی حیثیت اور اپنی عقل پر بھروسہ کرتے ہوئے
میلین مل میں آجائیں اور اپنے راستے کی رکاوٹوں کو خس و خاشاک کی طرح ہاتھ دے
لے جائیں۔ خیر ملکی حکمرانوں کے بعد میں ”خدمت سرکار کا نہ کسی طرح جائزہ نہیں۔ اگر
کوئی شخص سرکار کی حیثیت رکھتا ہے تو اس کی عزت اعمال کی وجہ سے ہونی چاہئے۔ اگر وہ
قابلیت اور ذمہ داری سے اپنے فرائض منصبی ادا کر رہا ہے تو اس کی عزت لازمی طور پر

خود بخود پیدا ہوگی۔ لیکن اگر کوئی حاکم اعلیٰ اپنے عہدے کا سزاوار نہیں اور قوم کی خدمت اور اُس کا صحیح اور اصل منصب پر پوری اہلیت سے نہیں کر سکا تو خواہ مخواہ خدمت سرکار کے نشے میں اُس کی خوشامد اور کامیابی کی بنا پر پوری قوم کے ساتھ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری قوم میں باوجود اقبالؒ کی اس قدر سرکھپائی کے ابھی تک اتنا شعور پیدا نہیں ہو سکا کہ ہم صحیح قسم کے حاکم کی عزت کریں اور غلط قسم کے حاکم کو تذلیع کا نشانہ بنا سکیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نہایت کروفر اور شان سے رہنے والے حاکموں کی تو خوب عزت کی جاتی ہے بغیر اس چیز کو چھاپنے ہوئے کہ ان کی یہ کروفر اور شان کن ذرائع سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے برعکس محنتی اور دیانتدار حاکموں کی صرف اس وجہ سے عزت نہیں کی جاتی کہ وہ سادہ لوگوں اسلامی طریقہ پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور اپنے ذرائع پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اگر عوام میں اتنا شعور ہو کہ جمہور کی شان رکھنے والے بد دیانت نمائندوں اور حاکموں کو ناپسند کریں اور ان پر بلا نشانہ تنقید بنائیں اور محنتی اور دیانتدار شخصیتوں کو یہ کہنے کی بجائے کہ وہ افسران اعلیٰ معلوم ہی نہیں ہوتے، اگر تعریف و ستائش سے یاد کریں تو آئندہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی خواہش کے مطابق ہی انہیں نمائندے اور حاکم ملیں گے۔ پس فقر سے مراد گداگری یا خانقاہی نہیں بلکہ استغنا اور خدمت سرکار کے فتنے سے مبرا ہونا ہے۔ اپنے بلند مرتبہ کام میں ہمدردی مصروف رہنا اور زیر کی کے ذریعے اپنے مقصد کو پالنے کا نام فقر ہے۔

ایک فقر سے کیا ہے سیاد کو پختہ گیری	ایک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جاگیر
ایک فقر سے قوموں میں سکینی ودگیری	ایک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکیبری
ایک فقر ہے شہیری ایک فقر میں ہے میری	میرا سب مسلمان سدا یہ شہیری

علامہ اقبالؒ انقلاب کے علمبردار تھے۔ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اُسی رد میں رہنا پسند
 دیکھتے تھے بلکہ زمانے کے ساتھ برسرِ پیکار ہو کر اُس کی اصلاح کے مدِ پے تھے۔ اُن کے
 انقلاب کا پیغام مختلف انواع کا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ انگریز اس پر صغیر پر تقریباً
 دو صدیوں سے مسلط تھا اور استقلال اور جبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ہماری قوم
 اتنی بے حس تھی کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالنے کے لئے کسی طرح کو شانِ نظر نہ آتی تھی
 چنانچہ اُنھوں نے انگریزوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا دُس دیا اور اس طرح ہمیں
 انقلاب کے لئے تیار کیا۔ اس کے علاوہ قوم کو سرمایہ داری، جاگیر داری اور دیگر مفسوس
 معادات کی غلامی سے بھی نجات دلانا چاہتے تھے چنانچہ اُنھوں نے سرمایہ داری اور
 جاگیر داری نظام کے مسلک اثر کو بھی دانشگاهِ الفاظ میں واضح کیا اور قوم کو بتایا کہ یہ نہ پر
 غیر ملکی حاکموں کی غلامی سے کسی طرح کم نہیں اور جب تک ہم اس غلامی سے جس آزادی
 حاصل نہیں کر لیتے ہماری فلاح ممکن نہیں۔ اپنی مشہور نظم ساقی نامہ میں فرماتے ہیں :-

پلا دے مجھے وہ سئے پرورد سوز کہ آتی نہیں فصلِ گلِ روزِ روز
 دہنے جس سے روشنیِ ضمیرِ حیات وہ سئے جس سے ہے ہستیِ کائنات

اُمّ شامِ ساقی پر دہاںِ راز سے

لڑا سے مولے کو شبانہ سے

زمانے کے انداز بدلے گئے جیہ راگ ہے سازِ بدلے گئے
 ہوا اس طرح فاشِ رازِ درنگ کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
 پرانی سیاست گریِ خوار ہے زمیں میرِ دسِ لٹاں سے بیزار ہے
 گیا دوبہ سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر ہماری گیا

گراں خراب چینی سنبھلے لگے ہمارے چٹے اُبلنے لگے
 مسلمان ہے تو جبر میں گر محو شد مگر دل ابھی تک ہے زنا پروش
 تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتائی عیسٰی کے پجاری تمام
 حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی

بھیں عشق کی آگ اندھیر ہے
 مسلمان نہیں آگ کا ڈھیر ہے

شراب کہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لاساقیا
 مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا مری خاک جگنو بنت کر اڑا
 خرد کو غلامی سے آزاد کر جوانوں کو پردوں کا اُستاد کر
 جوانوں کو سوزِ بگر بخش دے مرا عشق میری نظر بخش دے
 مری نادِ گرداب سے پاؤں کر یہ ثابت ہے تو اس کو سیاد کر
 مرادوں مری مذم گاہِ حیات گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
 یہی کچھ ہے ساقی متابعِ فقیر اسی سے فقری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں نسا دے ! سے
 نسا دے ٹھکانے لگا دے ! سے

فلسفہ خودی

علاوہ اقبالؒ اُس عہد میں پیدا ہوئے جب اُن کا ملک اوداُن کی ہم ذہب اقوام
یعنی اُن کا جملہ گرد و پیش غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور پستی کی استا اُن کا عقدہ
بن چکی تھی۔ مشرقی اقوام عالمِ فرنگ کے ہاتھوں پے در پے شکستوں کے بعد اپنی گزشتہ
عظمت و شوکت مکمل طور پر کھو چکی تھیں۔ کیا عرب، کیا ترک۔ کیا ایرانی اور کیا ہندوستانی
مسلمان سبھی زوال کی داستان پیش کرتے تھے۔ کہاں وہ زمانہ تھا کہ اسلامی سلطنتیں ایشیا
یورپ اور افریقہ میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اوداُن کی علم و عرفان کے میدان میں
حقیقتاً انہیں اور جُزئیہ تک پہنچا رہی تھیں اور کہاں یہ زمانہ تھا کہ نہ صرف اسلامی سلطنتیں
ختم ہو چکی تھیں اور علم و عرفان کی راہیں سد و تختیں بلکہ مسلمان بھی بحیثیت فرو اپنی عظمت
کو چھوٹا تھا۔ ہر محاذ پر شکست کا سامنا تھا اور ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ شاید مسلمان میں آسمانی
صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے فرنگی استعمار پرستوں کے غلبہ کو توڑ کر

اپنی مزد سوسائٹی کو زندہ کر سکے۔ احساس کمتری کا ہم سب پر اس قدر غلبہ تھا کہ ہم یہ فرض کئے بیٹھے تھے کہ شاید ہم اپنی تمام صلاحیتیں کھو بیٹھے ہیں۔ فرنگی کی تعلیمات نے ہمارے ذہنوں میں یہ چیز اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ ہمارا شعار محض اُن کی وفاداری اور خدمتِ سرکار ہے۔ ہمیں اگر تعلیم حاصل کرنی ہے تو صرف اس لئے کہ اُن کے دفاتروں میں کمرہ کر سکیں۔ زراعت پریشہ اختیار کرنا ہے تو صرف اس لئے کہ اُن کی فیکٹریوں کے لئے خام مال مہیا کر سکیں اور چھوٹی موٹی تجارت کرنی ہے تو صرف اس لئے کہ انگلستان کی تیار کردہ مصنوعات کے حق میں مقبوضے پڑتے ہوئے اُن کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کر سکیں۔ ہماری کارگزاریِ مشرق اس قدر گئی تھی کہ لاف زنی پر تو خوب زور دیا تھا اور فی الواقعہ بکار گزار، مگر مٹی، انوس تو یہ ہے کہ اب بھی جب کہ ہمیں آزادی حاصل کئے تقریباً ہجڑہ صدی کا موسم گزر چکا ہے۔ ہمارا طرزِ عمل یہی ہے۔ بازار میں جائیے اب بھی دوکاندار آپ کو IMPORTED یعنی درآمد شدہ چیزیں فروخت پیش کرے گا اور ملکی مصنوعات کی مذمت میں ایڑی چوٹی کا دھور لگا دے گا چاہے وہ کسیوں کو ملال ہو یا نکل کپڑا ہی کیوں نہ ہو جن کی اعلیٰ قسمِ مُسلّمہ ہے یعنی وہی غلامانہ ذمہ داری ہے۔ حالانکہ ملکی مصنوعات کے مقابلے میں درآمد شدہ چیز کی تعریف کرتے ہوئے کسی بھی بیوپاری یا غیر بیوپاری کو انتہائی ندامت اور خفت محسوس کرنی چاہیے کیونکہ ایک تو اس طریقے سے وہ اپنے ملک کو غیر ملکی مصنوعات کا زربِ بابت کر اپنے ملک کی مصنوعات کو کم تر ثابت کر رہا ہے۔ دوسرے ملکی خزانے کو زربِ مبادلہ کی صورت میں نقصان پہنچا رہا ہے۔ اور پھر ایک بیوپاری تو ہوتا ہی تجارت اور صنعت کا نمائندہ ہے۔ اگر وہ خود ہی اپنی صنعتوں کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف رہے تو پھر ملکی صنعتیں ٹوٹ کر چکیں رہتی ہیں جس طرح کہ درآمدِ مل کی بجائے کمزور کھل لاف زنی اب بھی اتنی ہی ترقی پذیر ہے جتنی علامہ اقبال کے زمانے میں تھی جس شخص نے فی الواقعہ اپنے دن بھر کا کام خوب محنت سے

کیا ہو اور عمل طور پر وہ اپنے کردار سے مطمئن ہو اُسے لاف زنی کی نہ تو ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی محنتِ شاقہ کے بعد اتنا وقت ہوتا ہے کہ منافع کرے بلکہ وہ کسی صحت مند کھیل یا مشغلے کی طرف توجہ دے گا تاکہ اُس کی جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ دور ہو۔ اور وہ اگلے دن کی محنتِ شاقہ کے لئے دوبارہ تیار ہو سکے۔ ملامہ اقبال نے اپنے گرد و پیش کے یہ حالات دیکھے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے لمبی مرض جس میں قوم مبتلا ہے یہ ہے کہ اُس نے خود اعتمادی اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو بروئے کار لانے کی خاصیتوں کو کبھی بھلا دیا ہے بلکہ وہ یہ مرض کو بیٹھے ہیں کہ خود اُن کا وجود شاید ہے ہی نہیں اور نہ ہی اُن سے کوئی قابلِ ذکر کام ہو سکتا ہے۔ اس مرض کی تشخیص کے بعد اور مشرقی اور مغربی فلسفہ و علوم سے بہتکر نائر استفادہ کرنے کے بعد ملامہ اقبال اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے پہلے قوم میں خود اعتمادی پیدا کی جائے اور اُنہیں بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں ہر شخص کو بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ اگر اُنہیں بروئے کار لایا جائے تو ہماری راہ میں بڑی سے بڑی مشکل کی بھی کوئی وقعت نہیں اور ہم ہر میدان میں بڑی تیزی سے ترقی کر سکتے ہیں بشرطیکہ مستقبلِ مزاجی، محنتِ شاقہ اور ذہنی کا دامنِ ہاتھ سے نہ چھوڑیں چنانچہ اس سلسلے میں نہایت تفصیل سے اُنہوں نے فلسفہ خودی کی تشریح و وضاحت اپنی تصنیف اُسرارِ خودی میں کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں تعلیمِ عالم کی بنیاد ہی خودی پر ہے اور اس زندگی کا تسلسلِ خودی کے استحکام کے باعث ہے۔

ہرچہ می بینی بر اُسرارِ خودی است	بیکر ہستی نہ اُسرارِ خودی است
آشکارا عالم پسندارِ کرد	خویشی را چون خودی بیدارِ کرد
غیر اُو پیدا است از اثباتِ اُو	صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ بُد
تا شود آگاہ از نیر وے خویش	میکشد بار وے اُو نیر وے خویش

خاندانِ اُد نقشِ صد اہر و دست تا بیار و صبحِ فردائے بدست
 ضلّہ ہائے اُد صد ابراہیم سوخت تا چراغِ یک محمد بر فردخت
 می شود از سہرِ اعراضِ عمل عامل و معمول و اسباب و معلل
 خیزد و انگیزد - پُرد و تابد - دُند سوزد - افروزد - کُشد - میرد - دہد
 دستِ ایام جو لا نکاو اُد آسماں موبے ز گروہِ راہِ اُد
 و انمودن خویش را خوںِ خودی است خُفتہ در ہر فردہ نیرؤے خودی است

تو تہ خاموش و بیابِ عمل

از عمل پاسبندِ اسبابِ عمل

چوں حیاتِ عالم از نذرِ خودی است پس بقدرِ استواریِ زندگی است
 نظرہ چوں حرفِ خودی از برکُند ہستی بے مایہ را گوہرِ کُشد
 بادہ از صنفِ خودی بے پیکر است پیکرش بہت پذیرِ ساغر است
 سبزہ چوں تابِ امید از خویش یافت بہت او سینہ گلشنِ شگفت
 شمع ہم خود را بخود زنجیر کرد خویش را از ذرہ ہا تفسیر کرد
 خود گدازی پیشہ کرد از خود دید ہم چو اشکِ آخر ز چشمِ خود چکید
 گر بفطرتِ پُختہ تر بُوے نگیں از جراحاتِ ہا بیا سُدے نگیں
 می شود سہ ماہِ دایرِ نامِ غیر دوشِ اُد مجروحِ بارِ نامِ غیر

(ترجمہ: ہستی کا وجود خودی کے آثار کی وجہ سے ہے۔ تو اس دنیا کی تعمیر جو کچھ

بھی دیکھ رہا ہے، خودی کے رازوں کی وجہ سے ہے جب انسان کی خودی خود اُسے بیدار کر دیتی ہے تو سمجھ بوجھ کی ایک دُنیا کو آشکارا کر دیتی ہے۔ اُس کی ذات میں سینکڑوں جہاں پوشیدہ ہیں۔

اُس کے قائم ہونے سے اُس کے علاوہ سیکڑوں مزید جہاں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اُس کا (بینی خودی کا) باند اپنی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی مکمل طاقت سے آگاہی تک کر لیتا ہے۔ اُس کا نظم سیکڑوں آج کے دنوں میں نقش بھرتا ہے۔ تب کہیں جا کر ایک (روشن) کل کر اپنے قبضے میں لاتا ہے۔ اُس کے شعلوں نے سیکڑوں اہامیوں کو جلایا۔ تب کہیں جا کر ایک محو کے چراغ کو روشن کیا۔ اُس کے عمل کے اغراض کے حصول کے لئے ہی مایل معلول۔ اسباب اور ملتیں ہوتی ہیں۔ وہ اُٹھتا ہے، براہِ گنجتہ ہوتا ہے۔ اُڑتا ہے، پھرتا ہے، دوڑتا ہے۔ وہ جلتا ہے۔ روشن ہوتا ہے۔ کھینچتا ہے۔ مرنے لگتا ہے۔ اور پھر اُگتا ہے۔ (یعنی جہدِ مسلسل کی مختلف صورتیں اُس کے مدِ پیش ہوتی ہیں) ننانے کی دستیں اُس کی جولاں گواہ ہے اور آسمان اُس کے راستے کی گرد کی ایک موج ہیں۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنا خودی کی ایک خصلت ہے اور ہر ذرے میں خودی کی قوتیں خوابیدہ ہیں۔ عمل کی قوت خاموش اور میناب ہے۔ عمل شروع کر دینے ہی سے عمل کے مقصد کے حصول کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

چونکہ دنیا کی زندگی خودی کی قوت کی وجہ سے ہے لہذا خودی کے استحکام کے مطابق ہی زندگی کا استحکام ہے۔ نظر سے کو جب خودی کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے تو اُس کی بے پایہ زندگی موت کی مانند ہو جاتی ہے۔ شرابِ خودی کی کمزوری کی وجہ سے بغیر جسم کے ہے اور اُسے سازگار احسان اٹھانا پڑتا ہے۔ بجز نے جب اُگنے کی طاقت اپنے آپ سے حاصل کی تو اُس کی گت نے گلش کے سینے میں شگاف پیدا کر دیا۔ شمع نے بھی جب اپنے آپ پر توجہ مرکوز کی تو فزروں سے اپنے آپ کو تیر کر لیا۔ جب تو اپنے آپ کو گھٹانے کا یعنی پشت کرنے کا پیشہ اختیار کرتا ہے اور اپنے آپ سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے تو آخر کار اُنسو کی طرح آنکھ سے گر پڑتا ہے۔ (یعنی اپنی قدر کھو دیتا ہے)۔ اگر گیند اپنی نظرت میں پختہ ہوتا تو عملِ جِراحت سے اُسے خود

آرام پہنچتا۔ لیکن وہ غیر کے نام کا سرمایہ دار بن جاتا ہے۔ اور اس کا کندھا غیر کے نام کے بوجھ سے بھروسہ ہوتا ہے۔

ترقی و تعمیر کے لئے لازمی ہے کہ مقاصد اپنے سامنے رکھے جائیں اور پھر انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ منصوبہ بندی میں ہی سائنسی اصول ہے کہ (TARGETS) یعنی منزلوں کا تعین پہلے کر لیا جائے اور پھر اُن کے حصول کے لئے سر توڑ کوشش کی جائے بغیر مقاصد یا (TARGETS) کا تعین کئے ہماری کوششوں میں کوئی مرگرمی پیدا نہ ہوگی اور نہ ہی کسی خاص جانب ہم اپنے شور کے استہمال کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ البتہ کوئی بلند مقصد اپنے سامنے رکھ کر اُسے حاصل کرنے میں ہر قسم کی مستعدی اور شور و کلام میں لایا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسنی (TARGETS) اور (ACHIEVEMENTS) یعنی کامیابیوں کے طریقہ کار پر نودر دیا ہے اور زندگی میں بلند مقاصد مقرر کر کے اُن کے حصول کے لئے کوشش پندردیا ہے۔

زندگانی را بقا از دُعا مست	کار و دانش را دوا از دُعا مست
زندگی در جستجو پوشیدہ است	اصل اُردو پوشیدہ است
آردو جانِ جہان رنگ و بوست	فطرت ہر شے امین آردو ست
از تمنا و قصہ دل در سینہ ہا	سینہ ہا از تاب اُردو آئینہ ہا
طاقت پر دوا ز بخشہ خاک را	خضر باشد موسیٰ و دراک را
دل ز بسوزِ آردو گیر و حیات	غیر حق میر و نچ آردو گیر و حیات
آردو ہنگامہ آراءے خودی	موج بیتا بے زور دیاے خودی
آردو صیدِ مقاصد را کند	دفتر افعال را شیرازہ بند
مقصدے مثل سحر تابندہ	اسوئے را آتش سوزندہ

مقصد سے اندر آسمان بالا تر ہے دل رُبا کے دل سے مولبر ہے
باطل دیرینہ راغز تنگتر ہے فتنہ در بیجے سراپا محشر ہے

مازہ تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تاباں بندہ ایم

(متوجہ : زندگی کو دماغ یعنی تعین مقاصد ہی سے بقا حاصل ہے اور اُس کے کاروں کو اس سے تیزی نصیب ہے۔ زندگی کا رازہ تجویز میں پوشیدہ ہے۔ اُس کی اہلیت آرزو میں پوشیدہ ہے۔ ہر چیز کی فطرت آرزو کی امین ہے۔ تم سے سینوں میں دل کا رقص ہے اور سینے اُس کی تب و تاب کی وجہ سے آئینوں کی طرح اصاف و شفاف اور درخشاں ہیں) وہ یعنی تعین مقاصد خاک کو پرواز کی طاقت عطا کرتا ہے اور عقل کے موسیٰ کے لئے خضر جیسا رہنما ثابت ہوتا ہے۔ آرزو کے سوز سے دل زندگی حاصل کرتا ہے۔ جب وہ زندہ ہوتا ہے تو یہ غیر حق کی موت ہے۔ آرزو کی وجہ سے خودی کی جنگمہ آرائی ہے۔ یہ دنیا سے خودی کی ہی ایک بیتاب موج ہے۔ آرزو مقاصد کے شکر کے لئے ایک کند کا درجہ رکھتی ہے اور یہ افعال کے دفتر کا شیرازہ اکشا کرتی ہے (یعنی قوتوں کو سمجھ کر کے اور انہیں یکسوئی دے کر حصول مقصد کی راہ پر ڈالتی ہے)۔ ایسا مقصد جو جسم کی طرح درخشاں ہو وہ بارہوا کے لئے (یعنی غیر اللہ کے لئے) بجلا دینے والی آگ ہے۔ ایک ایسا مقصد جو آئینہ سے بھی اونچا ہو ایک محبوب و لڑبا کی مانند ہے جو دل کو کھینچنے لے جاتا ہے۔ یہ یعنی مقصد بلند قدیم اور باطل چیزوں کو غارت کر دیتا ہے۔ ہم مقاصد کی تخلیق ہی سے زندہ ہیں اور آرزو کی شعاع ہی سے ہماری چمک دمک ہے)

عشق و محبت کو ملائہ اقبال نے خودی کا استحکام بنایا ہے۔ مگر او یہ ہے کہ کوئی بھی تعمیراتی منصوبہ اُس کے تحت لازمی طور پر اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کی فلاح و بہبود بھی لازمی

طوبہ پر منحصر ہوگی لہذا اگر دوسروں کی فلاح و بہبود بہادری سے پیش نظر ہے گی یعنی اس سلسلے میں ہم خواہ مخواہ کی کمزوری سے کام نہ لیں گے تو لازمی طور پر انسانیت کی فلاح کے تعمیراتی منصوبے جنم لیں گے اور انسانیت بحیثیت مجموعی ترقی کی طرف قدم بڑھائے گی اور اسی میں بہادری اپنا بھی فائدہ ہے۔ کسی بھی پیچیدہ مسئلے یا مخلص سیاسی رہنما کی مثال لے لیجئے انہوں نے شاید روز کی محنت، شقاوت اور تکالیف اسی لئے برداشت کیں کہ ان کی امتیں اور قومیں آنے والی صدیوں میں امن اور سکون سے رہیں اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوں۔ اگر ان کے دلوں میں امتوں اور قوموں کی فلاح کا جذبہ موجود نہ ہوتا، اگر انہیں انسانیت سے عشق و محبت نہ ہوتی تو لازمی طور پر آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

نقطہ فودے کہ نام او خودی است	زیر خاک یا شرام زندگی است
از محبت می شود پائند و تر	زندہ تر سو زندہ تر تا بستمہ تر
عشق را از تیغ و خنجر پاک نیست	اصل عشق از آب باد و خاک نیست
در جہاں ہم تلخ و ہم بیکار عشق	آب جیواں تیغ جو ہر دلی عشق
از نگاہ عشق حسد راست بود	عشق حق آخسر مر ایا حق بود
عاشق آموزد و مجو بے طلب	چشم فروغ و قلب یاقے طلب
در دل مسلم مقام مصطفیٰ است	آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است
بودیا منون خواب را عشق	تا کہ کسریٰ زیر پا ئے آتش
در شبستان جرا غلوت گزید	قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبیا چشم او محسوم قوم	تا بہ تخت کھردی خوابیدہ قوم
روز عشر اتسار است او	در جہاں ہم پردہ دار است او

اُس کہ بر اعدا و رحمت کشاد
مختر را پیغام لا تشریب داد
عاشقی ہر محکم شہ از تقلید یار
تا کند تو شود یزدان شکار
اند کے اندر جراتے دل نشیں
تو کہ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گافزن
لات و عتر آئے ہوس داسر شکن
لشکرے پیدا کن از سلطان عشق
جلوہ گر شو بر سر نہادان عشق

تا خدا سے کعبہ ہوا زود ترا

شرحِ اِنّی بایں سازد ترا

(ترجمہ : اس دُر کا نقطہ کہ جس کا نام خودی ہے۔ ہماری خاک کے نیچے زندگی کی چنگاری ہے۔ یہ محبت سے پائندہ تر ہو جاتی ہے۔ زیادہ زندہ، زیادہ چمک و دمک والی اور زیادہ پیش رفتار ہو جاتی ہے عشق کو تلواریں اور خنجر سے کوئی خوف نہیں عشق کی اصلیت پانی، ہوا اور خاک سے نہیں ہے۔ اس دنیا میں عشق کی وجہ سے صلح بھی اور جنگ بھی ہے۔ زندگی کا چشمہ، عشق کی جوہر تلواریں ہیں۔ عشق کی نگاہ کی وجہ سے ہنر (کامینہ) شوق ہو جاتا ہے، عشق حق آخر خود بھی سراپا حق ہوتا ہے۔ تو عاشقی سیکھ لے اور کسی محبوب کی تلاش کر۔ تو کہیں رُوح کی آنکھ اور کسی ایوب کا دل طلب کر مسلمانوں کے دل میں مصطفیٰ کا مقام ہے۔ ہماری آبرو مصطفیٰ کے نام ہی کی وجہ سے ہے۔ بوریہ اُس کے عذاب راحت کا صنوں ہے جس کی وجہ سے کسریٰ کا تاج اُس کی اُمت کے پاؤں کے نیچے آ رہا۔ اُس نے چراگی غار میں تنہائی کی راتیں بسر کیں اور اس طرح اُس نے ایک قوم، ایک آئین اور ایک محکومت پیدا کی کئی راتوں تک اُس کی آنکھیں بغیر نیند کے دھیں سیل تک کہ اُس کی قوم تختِ خسروی پر سوئی، محشر کے دن ہمارا اعتبار وہی ہے اور دنیا میں بھی ہمارا پروردگار وہی ہے۔ وہ کہ جس نے دشمنوں پر بھی رحمت کا دروازہ کھول دیا اور کہ لا تاخریب

کا پیغام دیا، اگر تو عاشق ہے تو تقلید یا رد (یعنی تقلیدِ مصطفیٰ) میں پھنک ماحصل کرنا کہ تیری گند کا شکار خود بند ہو جائے۔ کچھ عرصہ تو اپنے دل کی جڑ میں بیٹھ۔ تو اپنے آپ کو چھوڑ دے اور حق کی طرف ہجرت کر۔ تو حق سے استقام حاصل کر اور پھر اپنی طرف آ۔ ہوس کے لات دُغتری کو سرسپا توڑ ڈال عشق کی قوت سے ایک لشکر پیدا کر اور عشق کے قیام کی چوٹی پر جلوہ گر ہریاں تک کہ کعبے کا خدا تجھ پر جبرانی کرے اور تجھے اپنی جامل کا مرتبہ دے یعنی تجھے علیہ اللہ ربنا

علامہ اقبال نے افلاطون کے مشہور فلسفہٴ اعیان کی بہت سخت مذمت کی ہے چونکہ وہ

زندگی کے خشک و تر کا مقابلہ کرنے کی بجائے (ESCAPIST) یعنی زندگی سے فرار کے نظریے کا علمبردار تھا، اس کا فلسفہٴ قوم کے لئے ایک ایفونی کی حیثیت رکھتا ہے جو زندگی میں حرکت نہیں کی بجائے مدافعی سکون کی تلاش کا مقصد ہے۔ علامہ اقبال نے اُسے ”گروہ گوسفندانِ قدیم“ کا لہجہ بتایا ہے جبکہ خود علامہ اقبال نے قوم کو شیروں کی متحرک اور قوی غصلوں کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔ خود علامہ اقبال کے خیال میں اسطونے بھی افلاطون کے مشہور مسئلہٴ اعیان پر نہایت عمدہ تنقید کی تھی۔ بد قسمتی سے ہم لوگ تو اتنے بڑے بڑے ناموں کو جیسا کہ افلاطون کا نام ہے، مٹ کر خواہ مخواہ متاثر ہو جاتے ہیں اور اس کے فلسفے کو اور اسی طرح رومن ادب کے فلسفے کو آسانی سمیٹہ سمجھ کر اندھا دُعا تقلید کے دوپے ہو جاتے ہیں لیکن اگر ہم میں ذرا تنقیدی حس ہو جیسا کہ اُس مُفکرِ اعظمِ مشرقِ میمنہ میں تھی تو انہیں پتہ چلے کہ افلاطون اور اس کے دور کا فلسفہٴ قوم پر شیر کی بجائے میٹھڑ بکری کے خصائص کچھ تر کر دے گا۔ اور وہ دن دور نہیں کہ ہم موت کے سکوت ہی کو بینہٴ زندگی سمجھنے لگیں۔

دراپیدِ دیرینہٴ افلاطونِ حکیم از گروہ گوسفندانِ قدیم
عظمتِ سترِ زندگی و درونِ است شمعِ راسدِ جلوہ از افقِ است

بسکہ از ذوقِ عملِ مسدوم بُود جانِ اوِ وارفتہٗ مسدوم بُود
 مُنکرِ ہنگامہٗ موجود گشت خالقِ اعیانِ نامشہود گشت
 زندہ جانِ را عالمِ امکانِ خوش است مُردہٗ دلِ را عالمِ امیانِ خوش است
 آہوشِ بے بہرہ از لطفِ حرام لذتِ رفتارِ بر بگشتِ حرام
 راہبِ مایہ دارہ غیر از رمِ نداشت طاقتِ غوغائے ایں عالمِ نداشت
 از نشیمنِ سوئے گردوں پر کشود باز سوئے آشیانِ نامد فرد
 تو مہا اندِ سُکرِ اوِ مسوم گشت خُفتِ تازِ ذوقِ عملِ محروم گشت

دو جملہ : وہ دیرینہ راہبِ افلاطون حکیمِ قدیم پطیلوں کے گردہ میں سے تھا۔ اُس نے کہا کہ زندگی کا لازمہ جانے میں ہے اور شمع کے سیکڑوں جیسے اُس کے بجھ جانے میں ہیں۔ وہ ذوقِ عمل سے بہت زیادہ محروم تھے اُس کی جانِ مسدوم پر فریفتہ تھی۔ وہ آجکل کے ہنگامہ کا مُنکر ہو گیا اور فلسفہ اعیان کا خالق بنا جو غیر محبوب ہے۔ زندہ جان کے لئے تو ممکنات کی دُنیا خوش آئند ہے لیکن مُردہ دل کے لئے افلاطون کے فلسفہ اعیان کی دُنیا بھلی ہے۔ اُس کا ہر لطفِ حرام سے بے بہرہ ہے اور اُس کے کلب کے لئے رفتار کی لذتِ حرام ہے۔ ہمارے راہب نے فرار کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ دیکھا۔ اُس میں دُنیا کے شور و غوغا کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اُس نے اپنے آشیانے سے آسمان کی طرف اُڑان کی لیکن پھر اپنے آشیانے کی طرف نیچے نہ آیا۔ کتنی ہی قومیں اُس کے بے جان اور بے حرکت فلسفہ کی وجہ سے مڑھ جائیں۔ وہ سو گئیں اور ذوقِ عمل سے محروم ہو گئیں۔

مقامہ اقبال نے تربیتِ خودی کے تین مراحل بتائے ہیں یعنی اقامت (ORGANISA-

TIONAL DISCIPLINE -) ضبط نفس (SELF CONTROL) اور نیابتِ اہل

(ACTING AS GOD'S DEPUTY ON EARTH) پہلے مرحلے یعنی اطاعت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اونٹ کی طرح خدمت اور محنت کو شعار بنائیے جو بارِ حمل سے بھوکہ سرستی کے عالم میں دونوں اور ہفتوں کی بھوک پیاس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف سخت دُشوار راہ کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے یعنی ضبط نفس کی توصیف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمارا نفس شتر بے ہمار کی طرح خود پرندہ خود پرست اور خود سُرست نہیں چکا کہ مروانہ دار اس پر قابو پائیں اور اس کی قوتوں کو تعمیری میدانوں کی طرف استعمال کریں۔ تیسرا مرحلہ نیابتِ الہی ہے جو اپنے آپ میں خدائی صفات پیدا کرنے کی سعی کے مترادف ہے اور ظاہر ہے کہ جب ہم اس دنیا میں نائبِ حق بننے کی سعی کریں گے تو کتنی قوتیں ہمارے زیرِ نگین بنیں گی اور ہم نظامِ حیات اور عناصرِ فطرت کو کیسے باسانی شکر کر سکیں گے۔

اطاعت

خدمت و محنت شعارِ اختر است	مصدق استقلال کا رُ اختر است
گام اُردو راہ کم غوغا ستے	کارواں را ز درقِ صحرا ستے
نقشِ پائش قسمتِ ہر بیضہ	کم خورو کم خواب و محنتِ چیشہ
مستِ نیرِ یارِ محسوسِ دُود	پاشے کو باں سوئے منزل می رود
سر خود از کیفیتِ رفتارِ خویش	در سفرِ صابر تو اذاسواہِ خویش
تو ہم از بارِ فرائضِ سرِ ماب	بر خودی از عینِ دُعا حسنِ آلاب
در اطاعتِ کوششِ مے غفلتِ خلد	می شود از صبرِ پیدا اختیار
ہر کہ تفسیرِ مہِ دیویں گشتہ	خویش را زنجیری آئین گشتہ

شکوہ سنجِ سخنِ آئیں مشو از خود در مصطفیٰ بیرون ترو

ضبطِ نفس

نفس تو مثلِ شترِ خودِ رواست خود پرست و خود سوار و خود مراست
مرد شو آؤد زبامِ او بگف تا شوی گوہر اگر باشی خذف
ہر کہ بر خود نیست فرمائش ہواں می شود فرماں پذیر از دیگران
اہلِ قوت شو زور و دیاتو تا سوارِ اخترِ خاکِ شوی

نیابتِ الہی

گر شترِ بانیِ جانبِ بانی کُنی زیبِ سرتاجِ سیماں کُنی
نائبِ حق در جہاں بُودنِ خوش است بر عناصرِ حکمرانِ بُودنِ خوش است
نائبِ حق بچو جانِ عالم است ہستیِ او غفلِ اسمِ اعظم است
دو جملہ : اطاعت۔ اونٹ کا شعارِ خدمت اور محنت ہے اور اُس کا کام مبرا متعلیٰ

ہے۔ راہِ خودی کے وقت اُس کے قدموں میں کوئی شورشیں ہوتا اور وہ کارواں کے لئے سحر
کی کشتی کے مطالب ہے۔ اُس کے پاؤں کا نقشِ چرچل کی قسمت ہے۔ وہ کم کھانا ہے کم پیتا ہے
اور محنت اُس کا پیشہ ہے۔ وہ بھل کے بوجھ کے نیچے سرست چلا جاتا ہے اور پاؤں کو ٹٹا ہوا
مزل کی طرف دھکیلا جاتا ہے۔ وہ اپنی ہی رفتار سے سرست ہوتا ہے اور سفر میں اپنے ہوا
سے بھی زیادہ صابر ہوتا ہے۔ تو بھی اپنے فراموش کے بوجھ سے سرکائی نہ کر اور عندِ حسنِ انساب
استغادر کر اے غفلتِ خسار تو اطاعت اختیار کر جبرِ ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے جو شخص بھی

مرد پرویں کو تسخیر کرتا ہے وہ اپنے آپ کو کسی آئین کا پابند کرتا ہے۔ تو آئین کی سختی کا شکوہ نہ کر اور مصطفیٰ کی حدود سے باہر نہ جا۔

ضبطِ نفس۔ تیرا نفس شتر (بے ہمار) کی طرح خود پرورد، خود پرست، خود سوار اور خود نمر ہے۔ تو مرد بن اور اُس پر قابو پا اور اسی طرح اگر تو خدشہ ہے تو گوہر بن جائے گا۔ جو شخص کہ اپنے اُپر فرماں روائی نہیں کر سکتا وہ دوسروں کا مٹیلع ہو جاتا ہے۔ تو درو یا قوی سے قوت حاصل کرتا کہ تو اپنے نفس کے اُشتر پر قابو پا سکے۔

نیابتِ الہی۔ اگر تو شتر بن بننے میں کامیاب ہو جائے تو تو جیاں بانی کہے گا۔ اور سلیمانی کے نام کی زیب و زینت بن جائے گا۔ اس دنیا میں حق کو نائب بننا بڑی خوش آئند بات ہے۔ اور عاصمؓ ہنگامی کرنا بہت اچھی بات ہے۔ نائب حق دنیا جہان کی جہان کی مانند ہے۔ اُس کی جہتی اسمِ اعظم کے سائے کی مانند ہے۔

فلسفہ خودی اور تصویرِ ملت

علامہ اقبال نے جہاں اپنے آپ سے پوچست ہوئے اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانے اور خود اعتمادی و خود داری پر زور دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بے خودی کا درس بھی دیا ہے۔ اس طرح ان کی متوازن تعلیمات ایک متوازن شخصیت اور قوم کی تعمیر پر متوجہ ہوتی ہیں بعض لوگ ان کے درسِ خودی سے یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شاید علامہ اقبال نے کبر و نخوت کی تکفین کی ہے یا وہ ہم چہا دیر گئے نیست کے فلسفے کو اولیٰ سمجھتے تھے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ اول تو خودی سے زیادہ تر ان کی مراد خود اعتمادی اور اپنی قلب و خرد اور نظر کی جملہ صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانا اور ہر مشکل سے مشکل کام کو اپنی جدید مسلسل اور زندگی سے زیر کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے خود داری یعنی (SELF RESPECT) کا سبق بھی دیا ہے۔ اور دستِ سوال دروازہ کرنے کی سنتِ خدمت کی ہے لیکن اس سے ان کی مراد یہ ہرگز نہیں کہ کبر و نخوت اختیار کی جائے یا لاف زنی کا رویہ اختیار کئے رکھا جائے۔ اس کے برعکس کبر و نخوت

کی انہوں نے اکثر جگہ مذمت کی ہے اور لاف زنی کو پسماندہ اقوام کا خاصہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ ایسی اقوام جو کروارومیں سے محروم ہوتی ہیں اور گناہی اور پسماندگی کے امتیازِ غار سے نکلنے کا نام نہیں لیتیں۔ لاف زنی پر ہی تکیہ کرتی ہیں اور ہجھ ماو گئے میت اُن کا شیعہ ہوتا ہے۔ فرد اور ملت کے پاک رشتے کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنی تصنیف ”موجِ تہذیب“ میں اس امر پر زور دیا ہے کہ افراد جب تک مکمل طور پر اپنے آپ کو ملت کی وحدت میں ضم نہیں کر دیں گے ملت کا استحکام ممکن نہیں یعنی ملت کے مفادات کا خیال نہ رکھتے ہوئے اگر ہر فرد ایک ملک کا ہر طبقہ اور خطہ اگر اپنے اپنے مفادات ہی کو پیش نظر رکھے تو ظاہر ہے کہ ملت کو صنف پہنچے گا اور اسی قسم کا ستر از رد یہ بالآخر ملت کے خاتمہ پر منتج ہوگا۔ کچھ اسی قسم کا مسئلہ آج کل ہمالیہ قوم یعنی ملتِ اسلامیہ پاکستان کو پیش ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے معاشرے کے مختلف طبقات چاہے وہ سرمایہ دار طبقہ ہو یا مزدور طبقہ سبھی صرف اپنے مفادات کی نگہبانی کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور من حیث القوم یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس موثر بحال میں پوری قوم کا فائدہ ہے۔ حالت یہ ہے کہ ملازمتوں اور تجارت و صنعت وغیرہ میں ذات پات کی تیز کچھ اس قدر شدید ہو چکی کہ نہ صرف قومی مفادات کو ان پر قربان کیا جا رہا ہے بلکہ فی الواقعہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں کوئی ہار نہیں سمجھا جاتا۔ قوم کا بھلا ہو تو کیونکر ہو۔ ملازمتوں اور تجارت و صنعت کو چھوڑیے ملک کے مختلف خطوں کو لے لیجئے۔ ہم پنجابی، پٹھان، سندھی، بلوچ اور مہاجر پٹیل ہیں اور پاکستانی بعد میں۔ افسوس صد افسوس کہ ہم نے قاضی اعظم کے ارشادات کو بھلا دیا علامہ اقبال کے افکارِ عالیہ سے منہ موڑ لیا اور صوبہ پرستی اور زبان پرستی کی مکروہ لعنت کو گلے سے لگا لیا اور اس تو اس امر کا ہے کہ اسی مصیبت اور زہر کی وجہ سے ملک دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ہماری آنکھیں نہیں کھلیں اور ہم سندھی اور غیر سندھی بلوچ اور غیر بلوچ اور اسی

طرز کے دوسرے حکموں میں اس قدر شدت سے گرفتار ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ اسپین میں مسلمانوں کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ ایک وقت تھا کہ وہاں مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت قائم تھی اسپین کے جمہنگروں نے انہیں کہیں کا نہ رکھا سات سو سال تک اسپین میں حکمرانی کرنے کے بعد انھوں نے علاقہ پرستی اور قبیلہ پرستی کا وہ زہر اپنے اندر سمور دیا اور ایک دوسرے سے ایسا ٹکرائے کہ ان کا نام دشمن بھی مٹ گیا، کیونکہ دشمن جو عرصہ سے گھات میں تھا ایسا غالب آیا کہ اب ایک بھی مسلمان اسپین کی سرزمین میں موجود نہیں اور وہاں کی مسجدیں منکروں کی عبادت گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ کاش ہم انہیں سے سبق سیکھیں اور اپنے مزید جھگڑے ملت کی بقا کے ساتھ ساتھ اپنی خیریت کے نقطہ نظر سے ختم کر دیں اور ملت کی وحدت کو اس قدر استحکام بخشیں کہ دشمن کو اپنی ماسدانہ اور کینہ پرور نگاہیں ہماری طرف اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ علامہ اقبال کی مذکورہ تصنیف سے دیگر فرد و ملت کے عنوان پر اقتباس ملاحظہ ہوں۔

فرد را رب جماعت رحمت است	جو ہر اور اکال از ملت است
تا زمانی با جماعت یار باش	روئی چنگامہ احوار باش
حرزِ جاں کن گفتہ خیر البشر	ہست شیطان از جماعت دور
فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند	سلک و گوہر اککشتاں و اختر اند
فرد می گیر و ز ملت احکام	ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گرم شود	قطرہ و سست طب کلوم شود
ہر کہ آب از زمزم ملت بخورد	شعلہ بائے نفسہ در عودش فرد
فرد تنها از مقاصد غافل است	قوتش آشفتگی را حاصل است
قوم با مضب آشنا گرد اندیش	نرم رو مشبہ صبا گرد اندیش

پاؤں گل مانند شمشادش کند دست و پابند و کہ آزاوش کند
چوں اسیر ملتہ آئیں شود آہوئے زم خونے او مشکیں شود

(ترجمہ: فرد کے لئے جماعت کا ربط باعث رحمت ہے اس کے جوہر کے لئے کمال
مقت کی وجہ سے ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ آزادوں کے ہنگامہ کی رونق بنے تو جماعت کے ساتھ
دفاکیشی اختیار کر خیر البشر کے کسے ہوئے کو ازبر کر لے اور وہ قول یہ ہے کہ شیطان ہی جماعت
سے زیادہ دور رہتا ہے۔ فرد اور قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں جیسا کہ ہمارا دور موتی اور
کنکشاں اور ستارہ ہیں۔ فرد کا احترام مقت کی وجہ سے ہے اور مقت کا نظام افراد کے
باعث۔ جب فرد جماعت کے اندر گم ہو جاتا ہے تو پھیلنے کی خواہش رکھنے والا قہر حکوم
بن جاتا ہے۔ جس کسی نے مقت کے چٹے سے پانی نہیں پیا۔ نغمے کے شعلے اس کے سین میں
بجھ گئے۔ ایسا فرد اپنے مقاصد سے غافل ہے اور اس کی قوتیں اس کی آشفتگی کے سامنے
سائل ہوتی ہیں۔ قوم کو منابطے کا پابند کیجئے اور اسے صبا کی طرح نرم رو کیجئے شمشاد کی طرح
اس کی بنیاد زمین میں جکڑ دیکجئے اس کے ہاتھ اور پاؤں اس وجہ سے پابند کئے جاتے ہیں
کہ وہ آزاد رہ سکے جب وہ ملتہ آئیں کا اسیر ہو جاتا ہے تو اس کی خصلت اُس آوارہ ہونے
کو مشکیں بنا دیتی ہے)۔

افراد اگر مقت کے حلقے میں منظم ہو جائیں تو انہیں ایک ایسے صاحب دل اور صاحب
دہن کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے جو انہیں ترقی کی منازل پر نہایت سرعت سے آگے بڑھاتا
ہو ان کے لئے جنت کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔ افراد کی اکثریت تو خام ہوتی ہے اور اگر ان
کو الگ الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ سب کے سب علیحدہ علیحدہ ہرگز اتنی ترقی نہیں کر سکتے
کہ ان سب کا مرتبہ اور عزت الگ الگ جاپہنچے لیکن ملت کی شیرازہ بندی کے بعد ایک تو ان

کے وسائل مجتمع ہو کر ستر کا کردگی کی صورت پیدا کرتے ہیں اور اس کے علاوہ اگر اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اور کوئی پختہ کار ان کی رہنمائی کیلئے مل جائے اور ظاہر ہے کہ کوئی پختہ کار ہی زیادہ عرصہ تک قوم کی زمام اختیار اپنے ہاتھ میں نبھال سکتا ہے تو وہ مجتمع وسائل ظاہر ہے کہ ممکن طور پر بہتری کی صورت میں بروئے کار لائے جائیں گے۔

خدا صاحب دل پیدا کند	کو ز حرفے دفترے اہلا کند
ساز پرواز سے کہ از آواز	خاک را بخشد حیات تازه
ذره بے مایہ منو گیرد از د	ہر متاع ارج فو گیرد اند
زندہ از یک دم دو صد پیکر کند	محفلے رنگیں زیب ساغر کند
رشتہ اش کو بر فلک داور کرے	پارہائے زندگی را ہمگرے
تازہ انداز نقشہ پیدا کند	گلستاں در دشت و در پیدا کند
از لطف او پلتے مشعل سپند	بر جہد شور انگن و ہنگامہ بند
نقشہ پائش خاک را بینا کند	ذره را چشمک زن مینا کند
عقلِ عرباں را دہد پیرائے	بخشد ایں بے مایہ را سر ہائے
بندہ باز پاکشاید بندہ را	از خدا ونداں را باید بندہ را

دو ترجمہ : جہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایک صاحب دل پیدا کر دیتا ہے جو ایک حرفے ایک دفتر کے معنی پیدا کرتا ہے وہ ایک ایسا ساز ترتیب دیتا ہے جو خاک کو ایک نئی زندگی عطا کر دیتا ہے جو ستر ساز ذرہ اس کی وجہ سے چمک حاصل کرتا ہے اور ہر متاع اس سے ایک نئی زندگی حاصل کرتی ہے وہ ایک سانس سے دو جسم زندہ کر دیتا ہے اور ایک ساغر سے پوری ایک فصل کو رنگیں بنا دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا صلف ہوتا ہے جس کا ایک سر آسمان

پر ہوتا ہے اور جو زندگی کو شیرازہ بند کر دیتا ہے۔ وہ ایک تازہ اندازِ نظر پیدا کر دیتا ہے۔ اور جنگل و صحرا میں گلستان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی کوششوں سے قوم ایک تیز رفتار گھوڑے کی مانند شرم و ہنگامہ بیا کرتی ہوئی مصروفِ عمل ہو جاتی ہے۔ اس کے پاؤں کا نقش خاک کو دینا بخش دیتا ہے اور ذرہ کو سینا کا ہم پلہ بنا دیتا ہے وہ عقلِ معنی کو ایک معنی عطا کرتا ہے اور اس بے مایہ کو ایک سرمایہ عطا کرتا ہے وہ غلاموں کے پاؤں کی زنجیریں کھول دیتا ہے اور انہیں آقاؤں سے آزاد کر دیتا ہے۔

ملت کا تصور ہمیشہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کے بنیادی ارکان میں سے سب سے پہلا رکنِ توحید ہے۔ وہ وطن کی بجائے مذہبِ اسلام پر ملت کی اساس رکھتے ہیں اُن کی نظر میں حسبِ نسب اور وطنیت کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ مذہبِ اسلام ہی ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جس میں ممکن مساوات اور عدل کی ضمانت دی گئی ہے اور جس میں طبقاتی اور علاقائی کشمکش کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے علامہ اقبال نے ہمیشہ خود کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ قلب کی قوتوں کو بروئے کار لانے پر زور دیا ہے۔ خود یعنی عقل تو تھا ہر ہے کہ بے رحمانہ اور حریصانہ طور پر اپنی ذاتی بھلائی کے لئے ہر قسم کی ذاتی لوٹ کھسوٹ کو جائز گردانے لگی جس سے نہایت ہی مذہمِ قسم کا استعمال وجود میں آئے گا جیسا کہ یورپین اقوام نے دورِ حاضر میں دیکھا۔ علامہ اقبال نے اکثر زندگی اقوام کو ان کے اس رویہ کے پیش نظر کھنچ چروا کے گوروہ سے تشبیہ دی ہے۔ قلب کی قوتیں بھی اگر خود کی قوتوں کے ساتھ ساتھ بیدار ہوں گی تو عدل اور انصاف کے تقاضے کسی ہمت سے نہ چھوڑیں گے کیونکہ دل عشق و محبت کا منبع ہے اور عشق و محبت کسی ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے دوسروں کا استعمال پسند نہیں کرتا۔ مذہب سے لگاؤ قلب کی قوتوں میں استحکام پیدا کرتا ہے اور مذہب جس نے عدل و مساوات

اور یگانگت پر انتہائی زور دیا ہے اور ہر قسم کی وطنیت ملاقاتیت اور ذات پات کی تیز ترین دیاس
اور خوف کے بتوں کو توڑ کر اور ان باطل کی قوتوں سے نجات حاصل کرانے ہیں توحید کی طرف جلتا
ہے اور اس طرح ہیں غیر اللہ کے پنجے سے بچتا رہتا ہے پس انہوں نے توحید کو ملت اسلامیہ کا
رکنِ اول قرار دیا ہے ۔

اہل حق دار مر توحید از بر است	ور ائی التوحیدین عبد المصنر است
دین از دھسکت از دوائیں اند	زور از دوا قوت از دھسکیں اند
عالم را جہلہ آتش حیرت دہد	عاشقان را بر عمل قدرت دہد
پست اندر سایہ آتش گرد و بلند	خاک چوں اکسیر گرد و ارجمند
قدوت از برگزسد مندہ را	نوع دیگر آفریند بندہ را
بیم و شک سیر و عمل گیر و حیات	چشم می بینم ضمیر کائنات

چوں مقامِ عبودہ محکم شود
کاسہ دیدار زہ جام جم شود

اصل ملت در وطن دیدن کرچ	باد و آب و گل پرستیدن کرچ
بر حسب تمازاں شدن نادانی است	حکم او اندر تن و تن فانی است
ملت ما را اساس دیگر است	ایں اساس اندر دل باصنر است
حاضریم و دل بنائب بستہ ایم	پس زندہ این و آن دارستہ ایم
مُدعاے مائال مایک نیست	طرز و انداز خیال مایک نیست

ما ز تعنتائے او اغواں شدیم

یک زباں و یکدل و یکجا شدیم

(ترجمہ : اہل حق کو تو حید کے رمز یاد ہیں جو انا الحق الرحمن عہدؑ کی آیت میں مضمر ہیں۔ دین اور حکمت اور آئین اسی سے ہیں۔ ذریعہ قوت اور نگین سب اسی سے ہیں۔ اس کا جلوہ مالوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے اور عاشقوں کو یسین اہل قلب کو کھل پر اختیار دے دیتا ہے۔ اس کے سایہ میں ہفت، بلند ہو جاتے ہیں اور خاک اکسیر کی مانند مبارک ہو جاتی ہے۔ اس کی قدرت بندے کی قدر و منزلت بڑھا دیتی ہے اور اس کے لئے ایک نئی دنیا پیدا کر دیتی ہے۔ خوف و خشک مٹ جاتا ہے اور محل کو زندگی ملتی ہے آنکھوں کو کائنات کا منیر نظر آتا ہے۔ جب عہدؑ کا مقام مکمل ہو جاتا ہے تو بھکاری کا کاسر بھی جامِ حمید کے برابر ہو جاتا ہے۔

ملت کی بنیاد کو وطن میں مت دیکھیے ہر اپنی اور مٹی کی پر جاست کیجئے۔ حسبِ نسب پر ناز کرنا نادانی ہے۔ اس کا حکم جسم میں ہے اور جسم غانی ہے۔ ہماری ملت کی بنیاد دوسری ہے اور یہ بنیاد ہمارے دلوں میں پوشیدہ ہے۔ ہم حاضر میں لیکن ہم نے اپنا دل غائب کے ساتھ باندھا ہوا ہے اس لئے ہم اس اور اس کی پابندی سے آزاد ہیں۔ ہمارا دانا اور ہماری منزل ایک ہی ہے۔ ہمارے خیالات کا طرز و انداز ایک ہی ہے۔ اس کی نعمتوں کی وجہ سے ہم بھائی بھائی بنے ہیں اور ایک زبان۔ ایک دل اور کیا ہو گئے ہیں)

رسالت کو ملامت اقبال نے ملت کا دوسرا رنگ بتایا ہے۔ جیسا کہ ہم سب پر واضح ہے کہ ملت اسلامیہ کا پیسلہ آنحضرت مسلم کی ذاتِ گرامی سے شروع ہوا۔ ان کا وجود ایسے نائنے میں تصور پذیر ہوا جب ساری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور عرب قبائل میں جہالت اپنے عروج پر تھی۔ بت پرستی انتہا پر تھی۔ لوگوں کو زندہ دفن کرنا غلاموں کی خرید و فروخت اور قبائلی ملاقاتی مسافرت ہی ملکی قانون تھا۔ مذہب اور آسمانی کتابوں کو ان کے پیروکاروں نے اس قدر مسخ کر دیا تھا کہ وہ اپنی اصلی تعلیمات کو بالکل ٹوکر چکے تھے۔ اور جس کی لاشی اس کی جھینس

کے مصداق طاقت کے بن بستے پر ہی ہر مقامی اور بین القابلی فیصلہ صادر ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور پر ان کے بعد انہوں نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچایا جس میں اخوت مساوات و احترام آدمیت اور اسلامی جمہوریت کا پیغام تھا۔ آپ کی آواز پر جلد یا بدیر جلد عرب قبائل نے جو غیر شریعی طور پر تادیلی کے طویل مرحلے کے بعد دشمنی کے منتظر ہی تھے، الیک کما اور آہستہ آہستہ ایک عظیم ملت اسلامیہ نے جنم لیا جو نہ صرف عرب بلکہ ایران، ترک، افریقہ و وسطی ایشیا کے متعدد ممالک تک پھیلی ہوئی تھی۔ خلفائے راشدہ کے عہد میں تو صحیح معنوں میں ملت اسلامیہ کا سربراہ خلیفۃ المسلمین ہوا کرتا تھا جسے مسلمان قانڈین کی مسلمہ حمایت حاصل ہو اگر کسی تھی لیکن خلفائے راشدین کے بعد اگرچہ بات چیت کا دور دورہ شروع ہوا لیکن پھر بھی ملت اسلامیہ کا تصور قائم رہا اور امیہ عباسی اور عثمانی حکمران بھی خلیفۃ المسلمین ہی کہلاتے رہے۔ گویا اسلام کی عظیم قوت ان مختلف اقوام اور مختلف السنہ کے لوگ ملت اسلامیہ کے رشتے میں منسلک تھے اور اس طرح وہ دنیا کی عظیم ترین قوتوں میں شمار ہوتے تھے بلکہ یہ کتنا بجا نہ ہوگا کہ سات آٹھ سو سال تک پوری دنیا میں کوئی ان کی ہم پلہ طاقت پیدا نہ ہوئی یہاں تک کہ ہم نے اسلام کی صحیح تعلیمات کو چھوڑ دیا اور نسلی اور علاقائی تعصبات میں پڑ گئے خانہ جنگیاں شروع کر دیں اور اس حشر کو پہنچے۔ علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ کا وہی تصور پیش کیا ہے جس کے تحت مسلمان بحیثیت ایک ملت کے پوری دنیا پر چھائے رہے۔ انہوں نے مذہب اور رسالت محمدی ہی کو ملت کی اساس بنایا ہے اور بیت الحرام کو ملت اسلامیہ کا مرکز و محسوس قرار دیا ہے۔

از رسالت صدر ہزار یا ایک است	جزو ما از جزو لا ینفک است
آن کو شانِ اوست بحدیثی و تنزیہی	از رسالت حلقہ گرد یا کشید
حلقہ ملت عید افزا ست	مرکز اُو داری بطل است

ما ز حکمِ نسبتِ اور ملتیں	اہلِ عالم را پیامِ رحیم
از رسالت ہم فراغتیں	ہم نفس ہم مدعا غنیمتیں
دینِ فطرت از نبی آموغیم	در رہ حق مشعلے افروغیم
این گمراہ بحر بے پایاں دوست	ما کہ یکبائیم از احسان دوست
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد	بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
روغن از ما مصلحتِ ایام را	اور رسل را ختم و ما اقوام را
دل ز غیر اللہ مسلمان برگزید	نفرہ لا حقوم بعدی کا زند

[ترجمہ: رسالت کی وجہ سے ہی ہم اگرچہ لاکھوں میں لیکن سب ایک ہی ہیں ہمارے اجزائے نیک کے اجزاء ہیں۔ وہ جس کی شان عیدِ نبیٰ ہے، بڑی ہے۔ اس نے رسالت کے باعث ہمارے گرد حلقہ کھینچ دیا۔ ملت کا حلقہ امید افزا ہے اور اس کا مرکز بلحاظِ داوی ہے۔ ہم اس کی نسبت کے حکم کی وجہ سے ایک ملت ہیں اور دنیا بھر کے لئے رحمت کی پیام ہیں۔ رسالت کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہم فزا ہو گئے اور ہم سب ہم نفس اور ہم اندما ہو گئے۔ دینِ فطرت ہم نے نبی سے سیکھا ہے اور حق کے راستے میں ہم نے مشعلِ نبوت کی ہے۔ یہ موتی اسی کے بے پایاں سمندر کی وجہ سے ہے۔ ہم جو کہ ایک جان میں یہ اس کا احسان ہے پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت ختم کی ہے۔ اور ہمارے رسول پر رسالت ختم کر دی ہے ہمارے دھبے نہانے کی مصل میں رونق ہے انہوں نے ختمِ رسالت کی اور ہم نے ختمِ اقوام۔ مسلمان غیر اللہ سے اپنا دل ہٹا لیتا ہے اور لا حقوم بعدی کا نفر لگاتا ہے۔] مقامِ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کے آئین کی اساس قرآنِ حکیم کو بتایا ہے جس میں اقوام مساوات۔ اسلامی جمہوریت اور معاشی و معاشرتی انصاف کی ضمانت دی گئی ہے۔ دینِ مسلمان

دینِ حیات ہے اور اس کی تفسیر آئینِ حیات ہے۔ اسلام کا مذہب ایک نہایت ہی متحرک اور فعال معاشرے کے قیام پر زور دیتا ہے اور پروردگار نے اس کے برعکس سکون اور سکون کی مدت کرنا ہے۔ اسلام ہر لحاظ سے نئی ترقی و تعمیر پر زور دیتا ہے اور جدید سلسلے کا طلبہ دار ہے۔ قرآن کی تعلیمات تفکیک کی بجائے اجتماع پر زور دیتی ہیں۔ قرآن جو تعلیمات ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ نہ ان دکان کی قید سے آزاد ہیں۔ وسعتِ قلبی اور وسعتِ مشرب اس کا خاصہ ہے۔ قرآن مجید اقوامِ عالم کیلئے بھی ضابطہٗ حیات پیش کرتا ہے اور افراد کے لئے بھی آدابِ حیات پیش کرتا ہے۔ الغرض ضروری ہے کہ قومی آئین اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا انفرادی ضابطہٗ اخلاق قرآنِ حکیم کے پیش کردہ اصولوں کے مطابق ہو۔ اور مرضی یہی ایک صورت ہے جسے اپنا کر ہم اپنی گد مشتہ عظمتوں کو بچا سکتے ہیں۔

بہتے راقِ حوت چوں آئینِ زدوست	مثلِ خاک اجڑائے ادا و دمِ شکست
بستیِ مسلم ز آئینِ است دیں	باطنِ دینِ نبی ایں است دیں
برگِ گل شد چوں ز آئینِ بستہ شد	گل ز آئینِ بستہ شد گدستہ شد
نغمہ از ضبطِ صدا پیدا ستے	ضبطِ چوں رفت از صدا غونا ستے
آن کتابِ زندہ قرآنِ حکیم	حکمتِ او لایزال است و قیام
نفسِ اسرارِ نگوینِ حیات	بے ثبات از قوتِ تشکیب و ثبات
پختہ تر سودائے خام از ندرِ او	درفتہ با سنگِ جام از ندرِ او
می برد پاسبند و آزاد آورد	صیدِ بندان را بفریاد آورد
اے گرفتارِ رسومِ ایمان تو	شیوہِ ہائے کافرِ زندان تو
گر قومی خواہی مسلمان رہیستن	نیست ممکن جز بقرآن رہیستن

اجتناد اندر زمانِ انحطاط قوم را برم ہی پیچید بساط
 تنگ بر مار بگزار دیں شداست ہر لعلیے را زاد و دیں شداست
 اے کہ از اسرار دیں بیگانہ بایک آئیں ساز اگر فرزانہ
 (ترجمہ: قوت کے ہاتھ سے جب آئین چلا گیا تو خاک کی طرح اس کے اجزاء ہی ٹوٹ گئے۔ مسلم کی ہستی صرف آئین ہی سے ہے دین نبی کا باطن صرف یہی ہے جب اے آئین کی پابندی ٹی تو یہ برگ لگی ہو گیا جب پھول کو آئین کی پابندی ملی تو یہ لگی دستہ بن گیا آواز کی پابندی کے مناجلے سے غمزدہ پیدا ہوتا ہے۔ آواز سے جب مناجلہ چلا جاتا ہے تو آواز ہر شور و غوغا بن کر رہ جاتی ہے۔)

وہ زندہ کتاب بینِ قرآن حکیم جس کی حکمت لایزال اور قدیم ہے، وہ زندگی کے استحکام اسرار کا خزانہ ہے۔ اس کی قوت سے بے ثبات چیزیں ثبات حاصل کرتی ہیں، خام خالق اس کی وجہ سے پختہ تر ہو جاتا ہے اور اس کے نور سے شیشہ پتھر سے جاگھڑتا ہے۔ وہ قید و بند میں جکڑے ہوؤں کی بجائے آزادوں کی دنیا پیدا کرتا ہے اور جکڑے ہوئے شکار کے لئے باعثِ فزاید بننا ہے۔ اے کہ تیرا ایمان و سوم میں گرفتاری ہے اور کافری شیوہ تیرا قید خانہ ہے، اگر تو مسلمان کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو قرآن کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ انحطاط کے زمانے میں اجتناد قوم کی بساط کو دو گوں کر دیتا ہے و اجتناد اچھی چیز ہے لیکن انحطاط کے دور میں ماکوں کا اثر ہے اس کی وجہ سے مذہب کی غلط تائیدیں پیش کی جاسکتی ہیں لہذا نادر انحطاط میں اپنے گزشتہ سنہری زمانے کی کمالیت کی تقلید ہی اجتناد سے بہتر ہے، ہم دین کا راستہ تنگ ہو گیا ہے اور ہر کہینہ و مغلہ دین کا رازدار بن میٹھا ہے۔ اے کہ تو دین کے دھڑ سے بیگانہ ہے اگر تو غفلت ہے تو ایک ہی آئین کے ساتھ یوستہ رہ!)

الہیّت اور عبادت

کائنات کے پیدا کرنے والی اُس ذات باری تعالیٰ سے الگ اور مذہبی نقطہ نظر سے تو
 خیر ممکن ہے ہی نہیں فلسفی اندازِ فکر بھی اُس کی موجودگی کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے۔ چاہے ہم
 اُسے اللہ کا نام دیں۔ قدرت کا یا قادرِ مطلق کا۔ جب کوئی شخص اپنی ذات پر بعدِ سر کرتے
 ہوئے اور اپنی صلاحیتوں کو ممکن طور پر بروئے کار لاتے ہوئے اپنی۔ اپنے خاندان کی۔ اپنے
 ملک و قوم کی یا اپنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے بھرپور سعی کرتا ہے تو اپنی خودی میں خدا کی
 کی خودی کا عکس یا رنگ شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ ہر چیز
 چاہے حقّت سے اور جیسے چاہے ذلت سے۔ اللہ واحد لا شریک ہے۔ ہر چیز اُسی کی
 وجہ سے ہے۔ نہ ہی اُس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوا اور کوئی بھی اُس کی
 برابری کرنے والا نہیں لیکن جب ہم اپنی خودی کی قوّتوں میں خود شناسی۔ خود اعتمادی اور
 خود انکساری کی قوّتوں کو پہچانتے ہوئے سخت محنت اور تیرگی سے کام لیتے ہیں اور اس طرح

اپنی تقدیر بدلنے کی سعی کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی خودی کے خلاف
 ضرر و آزا میں یا اُس کی ذات سے ٹکریں بلکہ اُس کی خودی کا عکس اپنی قوتوں میں شامل کرنے
 کی سعی کرتے ہیں۔ ذاتِ باری ہر چیز پر قادر ہے اور اُسے ہر قسم کی طاقت حاصل ہے تبھی تو ہم بھی
 اس طاقت کا رنگ اپنے آپ میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ میں یہ طاقت
 نہ ہو کہ وہ اس کائنات اور اُس کی ہر چیز کی تخلیق پر قادر ہو تو آخر ہم کس کی تقلید میں ایسا کر رہے
 ہوں گے اور ہماری طاقت کا منہج کیا ہوگا۔

حضرت آدم اور حوا کے جنت سے نکلے جانے کا قصہ باقی مذہبی کتابوں کی طرح قرآن
 میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ شیطان کے اگساٹے پر حضرت آدم نے شجر ممنوعہ کا پھل چکھا جس کی
 بنا پر انہیں جنت سے نکالا گیا اور اُن کے نئے ٹھکانے یعنی زمین پر بھیج دیا گیا۔ بعض دفعہ
 اس کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی جاتی ہے اور یہ میسائیت کے پھیلائے ہوئے مفہوم کی وجہ سے
 ہے۔ یعنی حضرت آدم کے گناہ پر انہیں سزا کے طور پر اس دُنیا میں بھیجا گیا اور یہ دنیا انسان
 کے لئے ایک قید خانے کے موافق ہے جہاں وہ سزا بھگتتے کے لئے بھیجا گیا۔ اسلام میں اس
 کے برعکس یہ تصور پیش کیا گیا کہ انسان نے اپنی مرضی کا آزادانہ استعمال کرتے ہوئے شجر ممنوعہ
 چکھا۔ اُس کی پہلی غلطی اللہ تعالیٰ نے معاف فرمائی اور اُسے زمین پر بھیجا تاکہ وہ اُس کے
 نائب کے طور پر رہے۔ اُسے شخصیت کی دولت عطا کی گئی تاکہ وہ اس زمین کے خزانے اپنی ہمت
 کے لئے استعمال کر سکے۔ گویا اچھا صل یا بُرا صل کسی پر فرض نہیں کر دیا گیا۔ جیسا کہ بعض لوگ
 کہتے ہیں کہ ازل سے اُن کی قسمت میں لکھ دیا گیا۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے سب
 لوگوں کے لئے برابر کے مواقع مہیا کیے ہیں اور کیساں قابلیتیں عطا کی ہیں، اگر کسی میں ایک
 قابلیت دوسرے کی نسبت زیادہ عطا کی ہے تو دوسرے کی تلافی کیس اور قابلیت سے کر دی

اُمی ہے البتہ قانونِ قدرت یہ ہے کہ اچھے عمل کرنے والا شخص یعنی محنت شادہ میں ہم اور ملکا
اور تکلیف میں مصروف استقامت اختیار کرنے والا شخص۔ اور اسی طرح دوسرے بلند اعمال کا
عامل شخص اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بلند مرتبہ پائے گا اور سرخرو ہوگا۔ اس کے برعکس
بڑے اعمال اختیار کرنے والا شخص جو سست الوجود ہو۔ خود اپنی ہمت اور محنت پر بھروسہ نہ
کرتے مشکلات اور تکلیف میں ہمت ہار بیٹھے اور اسی طرح کے دیگر اعمال کا عامل ہو۔ وہ
اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ذلیل و خوار ہوگا۔ پس تقدیر یعنی اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق
ہونے سے یہ مراد ہے کہ اُس نے قانونِ قدرت وضع کر دیئے۔ مختلف اشیاء کے عمل اور رُخ
کے اصول وضع کر دیئے۔ اُن اصولوں کے مطابق مرحلے طے ہوں گے۔ اُن سنہری اُصولوں
میں سے ایک جو کہ انسانوں کے افعال سے قطعاً لکتا ہے وہ ہے جو اور پر کیا گیا یعنی محنت
ہمت۔ مشکل وقت میں مصروف استقامت اور ذریکے اس کا رد عمل ہوگا تعمیر اس کے برعکس
سست الوجودی۔ کم ہمتی۔ مشکل وقت میں ہمت ہار بیٹھنا اور ذریکے سے کام نہ لینا۔ اس کا
رد عمل ہوگا۔ ذلت اور سفلت۔ اگر بنی نوع انسان کا نظام اس قانونِ قدرت یا اصولِ قدرت کے
مطابق چل رہا ہے تو ہمیں الہیت یا قدرت یا قادر مطلق کی خودی پر ایمان لانا پڑے گا۔ ہاں اگر یہ
قوانینِ قدرت کبھی جھوٹے ثابت ہوتے نظر آئیں تو البتہ یہ شک کیا جاسکتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ
شاید موجود نہیں تھی اُس کے کوئی اصول ہر چیز میں جاری و ساری نظر نہیں آتے۔

اللہ تعالیٰ کی اور خصوصیات یہ ہیں کہ وہ خالق ہے۔ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ہم تم کی طاقت
رکھنے والا ہے۔ اور اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اوصاف بھی نفسی اندازِ فکر سے ممکن طور پر ثابت ہیں
یہ کائنات اس انداز کی نہیں کہ کسی وقت اپنی اس صورت میں کسی وجہ سے، اچھی ہو اور اُنسی طرح
ناختم ہو۔ بلکہ اس کی ہر چیز میں یہاں ہے اور اُن سے نئے سیکڑوں کی تخلیق کا مل جاری ہے۔

ختم نہیں ہوا پس ہم پر فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی تقلید میں ہم تخلیق و تعمیر کی سعی کریں۔
 پرانی اور میعاد ختم شدہ چیز تو اپنی موت مرہی جائے گی۔ ہمارا فرض ہے کہ موزاخر تخلیق و تعمیر کے لئے
 کوشاں رہیں کیونکہ یہی اللہ تعالیٰ کو عزیز ہے اور اسی میں اپنی اور کُلّی نفع انسان کی صلاح منظر ہے۔
 اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ سب کائنات ایک آئینے کی مانند موجود ہے جس سے کل واقعات؟
 کسی بھی زمانے کے ہوں ایک ہی نظر میں اُس کے سامنے ہوتے ہیں۔ کوئی واقعہ یا عمل اس کی تقلید
 سے اوچل نہیں۔ قرآن کی تعلیمات ہمارے لئے گہرے معنی رکھتے ہیں۔ قرآن میں بتایا ہوا کوئی واقعہ
 یا ذات باری تعالیٰ کی سنت ہمارے لئے کسی گہرے اخلاقی اور عملی سبق سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر
 چیز کا جاننے والا ہے لہذا ہمیں چاہیے کہ اپنے علم و فضل کے اساتذہ میں ہر دم کوشاں رہیں۔ علم
 حاصل کرنے کے لئے اگر ہمیں چین جانا پڑے تو وہاں بھی جائیں۔ اور پھر علم و فضل سے مراد صرف
 مذہبی علوم نہیں بلکہ جملہ جدید علوم بھی اسی صف میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دن کے رات میں تبدیل
 ہونے اور رات کے دن میں تبدیل ہونے میں ہمیں گہرے مطالب کی نشاۃ مذہبی کی ہے اور انہیں
 سمجھنے کی کوشش پر ہمیں اکسایا ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ جدید سائنس علوم میں کوئی امر غیر ممکن
 نہیں جیسے کہ بعض طبقات میں فرض کیا جاتا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طاقت سے انکار تو ممکن ہی نہیں جب وہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر تبدیلی
 اُسی کے وضع کئے ہوئے قوانین کے تحت طے پا رہی ہے تو کیا ہے کہ وہ ہر چیز کی طاقت کا ملک ہوا ہمارا
 فطرت سمجھتے بھی ہیں یعنی آدھی طوفان ہمند پہاڑ۔ دریا۔ اسی کے وضع کئے ہوئے اصول کے
 تحت کار فرما ہیں مگر یا اُسی کی طاقت کے ماتحت ہیں۔ اس میں ہمارے لئے یہ پیام ہے کہ ہم بھی
 عناصرِ فطرت کی تسخیر کی سعی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کریں۔ اگر امریکہ اور روس تسخیرِ فطرت کے
 میدان میں اتنا آگے جا سکتے ہیں تو آخر مسلمان کیوں پیچھے رہے جس کا ایمان ہی یہ ہے کہ تسخیرِ فطرت

کا پیغام اللہ تعالیٰ نے خود ہمیں نہ صرف اپنی صفات کی بنا پر بلکہ قرآن میں جگہ جگہ دیا ہے۔
 اللہ تعالیٰ کی ایک خصوصیت ابدیت ہے۔ کائنات تو اُس کا پیدا کردہ ایک مسموری کھانا
 ہے۔ یہ کائنات قائم رہے یا نہ رہے، یا اس کائنات کے بعد اور کئی کائناتوں کا دور شروع ہو
 یہ تو کچھ کما نہیں جاسکتا۔ البتہ یہ امر واضح ہے کہ ان سب سلسلوں کا خالق ابدی حیثیت رکھتا
 ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اسی صفت کی تقلید میں ایک تو بنی نوع انسان نے اپنی ابدیت کی کوشش
 اس طرح کی کہ ایک زندگی کے بعد دوسری زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ بنس انسان کے پیداؤ کا عمل
 جاری ہے۔ وقت آنے پر موتیں آتی ہیں لیکن بنی نوع انسان کی زندگی وہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ
 زندہ ہے اور ایک طرح کی ابدیت اُسے حاصل ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے برابر ابدیت اُسے
 حاصل نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اگر یہ زمین یا کائنات ہی فنا ہو گئی تو انسان کی بقا کاں تک قائم رہ
 سکتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ابدیت میں ہمارے لئے یہ پیغام موجود ہے کہ ہم اس دینی
 زندگی میں ایسی تخلیقات اور اعمال کر جائیں جو رہتی دنیا تک ہماری یاد تازہ رکھیں اور ہمیں
 انسانیت کے فتنے کے طور پر یاد کریں، مشکلات اور تکلیفات میں بھی نہ صرف صبر و استقامت کو
 قائم رکھیں بلکہ تکلیف سے پیدا کردہ بد دوست طاقت کو مکمل طور پر بروئے کار لاتے ہوئے تعمیری
 اور تخلیقی کاموں میں انسانی جوش و خروش سے سرگرم مل رہیں۔

اسلام میں عبادت کا تصور یہ ہے کہ نہ صرف اللہ اور اُس کے پیغام کو سمجھا جائے بلکہ اُس کی
 رفاقت محسوس کرتے ہوئے اپنے نیک اعمال اور بلند عزم میں اُس کی طاقت کو شامل حال کیا جائے۔
 اس دنیا کا حقیر ترین شخص بھی عبادت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رفاقت کے احساس کا فخر محسوس
 کرتے ہوئے اپنے آپ کو بہت بلند و بالا تصور کرتا ہے۔ اچھا اپنے آپ میں حقیر ہونے کے عزم اور
 جہتیں پاتا ہے۔ پس اسلام میں عبادت کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ دن میں پانچ وقت یا باقی توارکات

کے موقع پر جامعہ کے دن ہم دسی طور پر یاد دہانی کے دکھاوے کے لئے مسجد میں جا کر تفرقہ طریقہ پر نماز اور اکھیر، بلکہ مزدی یہ ہے کہ سب سے پہلے زہم نماز کے مضمون کو سمجھیں اور اس پر غور و خوض کریں۔ کلام اللہ کی اتنی سی قدر تو ہمارے لئے فرض بنی چاہیے کہ ہم اسے سمجھ بوجھ تو لیں۔ اس کے بعد اس کلام میں دیئے گئے احکامات کی روشنی میں پامل بننے اور دنیا و دنیا کا کوس میں بہت دانتھار ڈھونڈنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی رفاقت و امانت محسوس کرنی چاہیے۔ عبادت بطور روحانی روشنی کے ایک نہایت اہم عمل ہے جس کے ذریعے ہماری شخصیت کا چھوٹا سا جزیرہ اپنا ایک اپنی خود کا مصلحتوں کی طاقت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ روحانی روشنی انسانی شخصیت کی تعمیر نو میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ حقیقتاً عبادت کو ذہنی عمل کے ساتھ ایک مزدوری اضافی مجزؤ سمجھنا چاہیے۔ قدرت کا سائنسی مطالعہ ہمارے لئے حقیقت سے قریبی تعلق پیدا کرتا ہے اور اس طرح ہمارے اندرونی شعور کو تیز تر کر دیتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علم کی جملہ تلاش عبادت ہی کی ایک قسم ہے اور حصولِ علم ہی جن میں جدید سائنسی علوم بھی شامل ہیں انسان میں تسخیر عناصر کی طاقت پیدا کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اسلام میں اجتماعی عبادت کے نظریے کی افادیت پر بھی زور دیا ہے۔ عبادت کی دُوح ہی اجتماعیت اور معاشرتی ہے۔ ایک فقیہ بھی جب دُنیا کو ترک کر کے عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو اُس کے اس عمل کے تحت یہی خیال کا فرما ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رفاقت سے حظ اُٹھائے گا۔ باجماعت عبادت میں فلسفہ مضرب ہے کہ جب ایک پورا اجتماع اکٹھا ہو کر کسی ایک جذبے پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے تو اُس کی دل و نگاہ اور سجدہ و سجود کی توحشیں بے انتہا تیز ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ایک اہم نفسیاتی مسئلہ ہے کہ اجتماعیت ایک عام آدمی کی سجدہ و سجود کی طاقت کو کتنی گنا زیادہ کر دیتی ہے۔ اُس کے جذبات کو زیادہ

گھر کرتی ہے اور اُس کی قوتِ ارادی کو اس قدر زیادہ مضبوط بنا دیتی ہے گرا اُس میں دُور
مہر دیگیا ہر عبادت کے وقت ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جاتے ہیں یعنی اللہ کے سامنے
بیچ ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اگر عبادت صحیح جذبے سے کی جائے تو ذاتِ باری کی
خودی کا عکس اپنی خودی میں پا کر بھرپور صلاحیتوں کا حامل اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ نماز کے وقت امیرِ غریب، حاکمِ محکوم گورے، کالے سبھی ایک صف
میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں اور اس طرح مساوات کا اصول واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔
اللہ تعالیٰ نے نبی نوح انسان کو جو مختلف نسلوں، قوموں اور قبائل میں تقسیم کیا ہے سو محض شمس
کے لئے ایسا کیا گیا ہے، اصل بڑی اور بہتری تو اُن کے اعمال ہیں، اگر کسی زمانے میں کالے
لوگ محکوم و مذہوم رہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اُن کا رنگ کالا تھا یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کالوں
کو بنایا ہی محکومی کے لئے ہے بلکہ اُس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کالے لوگ بے عمل ہو چکے تھے۔
اُنہوں نے علوم و فنون کو خیر باد کہہ دیا تھا، اُنہوں نے محنتِ شاقہ کی عادت چھوڑ دی تھی اور اپنے
منازع کو استعمال کرنا بھول چکے تھے۔ اُن میں بے اتفاقیوں پیدا ہو چکی تھیں۔ نتیجہً ظاہر ہے تباہی
قدرت نے اپنا ردِ عمل دکھایا اور یہ لوگ محکوم و مذہوم ہوئے۔ جیسی طرح گورے لوگ بھی بعض تو
میں ایسی وجوہات کی بنا پر قلیل رہے ہوں گے لہذا کالے اور گورے کی تیز یا برابریت اور شمولیت
اختیارِ انتہائی غیر اسلامی ہے اور نماز کا اصل اس مساوات کو سب سے زیادہ واضح کرتا ہے۔

مذہب کیونکر ممکن ہے؟

مشہور فلاسفر کانٹ (KANT) نے سب سے پہلے یہ سوال اٹھایا کہ کیا علم بالہدایہ ممکن ہے۔ اُس کے خیال میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ کسی تجربے کے لئے حقیقت کی وسیع دنیا سے باہر رہنا اُس کے خیال میں ممکن نہ تھا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ کانٹ کا یہ خیال آسانی سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اُن کی رائے میں سائنس کے جدید نظریات مثلاً وقت اور خلا کا محدود ہونا۔ کائنات کا کسی خیال پر مبنی ہونا مادہ کا روشنی کی لہروں سے ممانعت وغیرہ اور تقدیر کا غیر معینہ ہونا یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مذہبیات کا منطقی جواز پیش کرنا مشکل امر نہیں۔ جیسا کہ کانٹ کا خیال تھا۔

کانٹ کا نظریہ صرف اُسی صورت میں درست بنا جاسکتا ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ عام سطح کے تجربات کے علاوہ اور کسی قسم کا تجربہ ممکن نہ تھا۔ پس دیکھنا یہ ہے کہ عام سطح کے تجربات حقیقتِ انسانی کے احاطہ میں آنے والے تجربے

کے علاوہ کسی اور قسم کا تجربہ بھی ممکن ہے جو انسانی علم میں اضافہ کا باعث ہو سکے۔ اگر کائنات کا مفروضہ غلط ثابت ہوا یعنی یہ ثابت ہوا نظر آجائے کہ عام سطح کے علاوہ اور تجربات بھی ایسے ہو سکتے ہیں جن کے نتائج جنی نوع انسان کی فلاح کا باعث بن سکیں تو مذہبیات یا مابعد الطبیعیات کا ممکن ہونا بالکل واضح ہو گا۔

سائنس کے موجودہ نظریات سے یہ واضح ہے کہ بیرونی دنیا جس کا ہم حیات کی مدد سے احاطہ کر سکتے ہیں ہو سکتا ہے کہ محض ہمارے ذہن یا شعور کی تعمیری صلاحیت کا نتیجہ ہو ہو سکتا ہے کہ وقت اور خلا کے مختلف کسٹم ہوں جو ہمارے احاطہ سے باہر ہوں۔ اور جن کی سمجھ بوجھ ہمارے عام تجربات کی زد میں نہ آئے جیسا کہ سائنس کے جدید نظریات سے ظاہر ہے۔ اس طرح تجربات کی اداسطیں بھی ہو سکتی ہیں جو ہمارے عام تجربات کے علاوہ ہوں۔ الٹاتی وقت اور خلا کی تمیزیں بھی ہمارے صوفیوں نے استعمال کی ہیں پس موجودہ سائنسی نظریات اور اونچے صوفیاء کے خیالات دونوں اسی گتہ پر ہماری نظر مرکوز کرتے ہیں جنہیں مابعد الطبیعیات کہا جا سکے۔

ذہب اپنی سطح کے تجربات کا بھی اسی طرح جائزہ لیتا ہے جس طرح سائنس اپنی سطح کے تجربات کا جائزہ لیتی ہے اور ذہب نے اس تنقیدی جائزہ کی بنیاد سائنس سے بہت پہلے ڈال دی۔ اس مسئلے کو ایک اور طریقے پر بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ کیا صرف مابعداً شعوری یا دینی ارتقا کا طریقہ ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے عناصرِ فطرت پر قابو پایا جا سکے۔ پروفیسر ریڈنگٹن کا کہنا ہے کہ فرس حقیقت کا صرف جزوی طور پر جائزہ لے سکتی ہے۔ بحسبِ رسالت۔

اتحاد۔ اور مقاصد ہمارے شعور اور حیات کے عکس کو تخلیق کرتے ہیں۔ یہ سائنس کا میدان ہے۔ ہمارے وجود کا دوسرا جزو یعنی روح بھی ہماری خودی کی بُندی کا باعث بن کر میں تغیرِ فطرت

کا راستہ دکھاتے ہیں۔ اور یہ روحانیت، مذہبیات یا مابعد الطبیعیات کا راستہ ہے۔ جدید انسان ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے شعور کی تعمیر کے انحصار نے اُسے عناصرِ فطرت پر عبور تو دے دیا لیکن وہ خود اپنے مستقبل پر سے اعتبار کو مٹا گیا۔ اپنی ذہنی کادشوں کے نتائج سے مرعوب ہو کر وہ روحانیت کے ساتھ رہنے یا اپنی اندرونی آواز پر لبیک کہنے کی طاقت کو کھو بیٹھا۔ یہ حال تو مغز کا بے مشرق کا حال اس سے بھی بُرا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کا تصور اور مذہبیات کی بلندی جس کی وجہ سے مسلمانوں نے مشرق اور مغرب میں اس قدر زیادہ ترقی کی اب مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ مذہب کی اعلیٰ قدروں کو چھوڑ کر اب مذہبیات کے معنی یہ سمجھ جاتے ہیں کہ دنیا کو مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے اور اس طرح اپنی جہالت اور روحانی فقدان میں ہی مکمل خوش محسوس کی جائے جلا کر مذہب اپنے بلند اور ارفع معنوں میں نہ تو کوئی بندھائی جا رہا ہے نہ ضابطہ ہے نہ مولویت کا راج ہے اور نہ ہی کسی قسم کے مخصوص رسوم و رواج کا پابند ہے۔ اس کے برعکس مساوات فلاحی نہیں تو بے انسان یعنی فلاحی معاشرہ اور ترقی و تعمیر کے نظریات جس میں جدید علوم کی ترویج و ترقی بھی شامل ہے مذہب ہے جس میں روحانیت کی چاشنی بھی بھر دی گئی ہے پر موجود ہو یہی صورت حال انسانیت کی نجات اور بلند ترین مقاصد کے حصول کا باعث بن سکتا ہے۔

علامہ اقبال کے مطابق مذہبی زندگی کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی اقتصاد، سوچ، بھاریا ریاضت اور حقیقت یا صحیح راستے کو پالینا۔ پہلے حصے میں مذہبی زندگی ایک قسم کا ضبط و نظم یا ڈسپلن پیدا کرتی ہے جس میں فرد یا قوم کو احکامات کی مکمل پابندی کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ اس کو سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کریں یہ روئے کسی قوم کی سماجی یا سیاسی ترقی کے لئے تو بہت اہم ہو سکتا ہے لیکن کسی فرد کی اندرونی ترقی کے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نظم و ضبط کے بعد اسے شعوری اور ذہنی طور پر سمجھنے کا دور آتا ہے۔ اس دور

میں اُن احکامات اور نظم و ضبط کی شعوری توضیح ضروری ہوتی ہے۔ اس دور میں مذہبی زندگی کی بنیاد باعد الطبیعات ہوتی ہے۔ اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں باعد الطبیعات کی جگہ سائنیکا لوجی یا نفسیات لے لیتی ہے اور مذہبی زندگی پر خواہش پیدا کر دیتی ہے کہ الٰہیاتی حقیقت کے ساتھ انتہائی قرب کا تعلق پیدا ہو۔ اس مرحلہ پر مذہب زندگی اور طاقت کو اپنے آپ میں سمو لیتا ہے۔ مذہب کے اس آخری مرحلے میں ہی وہ روحانی تجربے حاصل ہوتے ہیں جس میں تسخیرِ فطرت کے راز افشا ہوئے ہیں۔ بد قسمتی سے مذہبی زندگی کے اس حصے یعنی تصوف کو دنیا کے تیغ دیئے اور حقیقت سے بہت دور دھو جانے کا نام دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ مذہب کی بلندیاں بہتر سے بہتر زندگی کی تلاش کا نام ہے اور جس کی بنیاد تجربات پر ہے۔ اور سائنس سے بہت پہلے مذہب نے اس کی بنیاد رکھی حقیقت تو یہ ہے کہ مذہبی اور سائنسی توجہات اگرچہ اُن میں مختلف طریقے استعمال ہوتے ہیں اپنے آخری مقصد کے لحاظ سے یکساں حیثیت کے حامل ہیں۔ دونوں کا مقصد یہی ہے کہ اصل حقیقت تک جا پہنچیں شیخ احمد سرہندی نے روحانی ارتقا کی منازل بتاتے ہوئے فرمایا ہے کہ قلب کے ارتقا کی پہلی منزل میں انسان کو دنیا کی ہر شے میں خدا کا عکس نظر آتا ہے یعنی خدا کے علاوہ کوئی اور چیز یاں تک کہ خود اُس کی زندگی بھی نظر نہیں آتی۔ ارتقا قلب کے آئندہ مرحلے روح، سخنِ حق اور غیرِ خفا ہیں۔ ان میں سے ہر شے میں اُسے اپنے مخصوص تجربات کا سامنا ہوتا ہے اور انہیں مجرماً طرد پر عالم امر کہا جاتا ہے۔ ان جلد شیخوں سے گزر جانے کے بعد حقیقت کے متلاشی کو الٰہی امور اور الٰہیاتی صفات کے پُرانہ اور مطالب واضح طور پر مل جاتے ہیں اور بالآخر ذاتِ الٰہی کی روشنیاں بھی اُس پر واضح ہو جاتی ہیں۔ علامہ اقبال عبادِ نامہ میں فرماتے ہیں کہ اپنی حالت کا تجربہ کرنے کے لئے جنہیں گواہوں سے اپنے شیخ میں مقام کے بارے میں استفسار کرو۔

پہلا گواہ خود تھا وہ اپنا شعور ہے۔ دوسرا گواہ کسی اور کی خودی کا شعور ہے اور سب سے آخر کا
 گواہ الہیاتی شعور ہے۔ اگر الہیاتی شعور کی روشنی میں بھی تم پورے اُتے ہو تو واقعی سمجھ لو کہ
 تم نے اصل حقیقت کو پایا۔ کیونکہ وہی شخص اصلیت کا حامل ہے جو اللہ تعالیٰ کے مہیار
 پر پروا اُتر سکتا ہے۔

مذہبی تجربے کی ماہیت اور خصوصیات

پروفیسر وائٹ ہیڈ کا قول ہے کہ مذہب کا زمانہ منقطع کا زمانہ ہے۔ یعنی مذہب کی منطقی توجیح پیش کی جاسکتی ہے لیکن اس کے پر معنی نہیں کر فلسفہ کسی طرح مذہب سے جُملد تر ہے۔ مذہب حقیقت کا جزوی جائزہ نہیں لیتا یہ محض خیال ہے۔ نہ محض جذبہ یا احساس ہے اور نہ ہی محض عمل ہے۔ بلکہ یہ انسان کی بحیثیت مجموعی ترجمانی کرتا ہے۔ پس مذہب کی توجیح کے سلسلے میں فلسفے کو اس کی یعنی مذہب کی مرکزی حیثیت پہچانی پڑے گی۔ نہ ہی اس امر کی ضرورت ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ خیال اور اندرونی جذبہ یا احساس یا بشارت (یا اسے ہی کیجئے) کسی طرح ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ان دونوں کی بنیاد ایک ہی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ خیال جو ذہنی شعور یا (INTELLECT) کی پہلی درجہ ہے حقیقت کو متشوّراً متشوّراً کر کے مرحلہ بہ مرحلہ حاصل کرتا ہے۔ جبکہ اندرونی جذبہ یا روحی حقیقت کو بحیثیت مجموعی ایک ہی دفعہ حاصل کر لیتی ہے۔ ذہنی شعور حقیقت کے مادّی یا دنیاوی پہلو

کو پیش نظر رکھتا ہے جبکہ وہی یا مذہبی تجربہ اس کے ابدی پہلو پر نظر رکھتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ جیسا کہ برگسان کا خیال ہے وحی یا روحانی تجربہ ذہنی شعور کی ہی ایک بلند تر صورت ہے۔

انسان کی تقدیر کا یہ ایک لازمی جزو بنا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد بچھلی ہوئی کائنات سے بھٹ کر بے فائدہ سے استفادہ کرنے کا باعث بنے۔ اس سلسلے میں کہیں تو اُسے خود اپنے آپ میں کائنات کی قوتوں سے تباہ کرنے کے لئے چمک پیدا کرنی ہوگی اور کہیں اپنی پوری قوت کو تسخیر کائنات پر صرف کرنا ہوگا تاکہ اُسے اپنے فوائد کے لئے استعمال کر سکے اور ترقی و تعمیر کی اس راہ پر خود اللہ تعالیٰ اُس کا مدد و معاون ثابت ہوتا ہوا نظر آئے گا بشرطیکہ آدمی خود دستِ بہمت دراز کرنے میں پہل کرے۔

لیس للانسان الا ما سعی

(ترجمہ : بے شک اللہ تعالیٰ انسان کی حالت تبدیل نہیں کرے گا جب تک وہ خود

اپنی بہتری کی کوشش نہ کریں)

اگر انسان دستِ بہمت دراز کرنے میں پہل نہیں کرتا اگر وہ زندگی میں اعدادی طور پر ترقی کرنے کی خواہش کو محسوس نہیں کرتا تو پھر اُس کی روح جو اُس کے اندر موجود ہے اور اُسے ترقی و تعمیر کی طرف ہر لحاظ سے متوجہ کرتی رہتی ہے پھر کی طرح سخت ہو جاتی ہے اور مردہ ہو جاتی ہے جس کے لئے خود ہماری جے جی دتہ دار ہوتی ہے۔ لیکن زندگی اور آگے بڑھنے کی خواہش کی تکمیل عقل اور ہوش مندی تسخیرِ فطرت کے سلسلے میں عقلِ معلوم اور محنتِ شائدہ ہی سے ہوتی ہے گویا روحانی یا مذہبی جذبہ سے محنتِ شائدہ کی بجائے تو ترقی و تعمیر کی تمام خواہشات پوری ہو سکتی ہیں۔

مذہبی یا مٹو فیانہ تجربے کی خاص خاص خصوصیات علامہ اقبال نے یوں بیان کی ہیں۔

۱۔ قصوف کے تجربے کے سلسلے میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ تجربہ بلا واسطہ طور پر ہوتا ہے۔

یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی ذاتِ باحقیقت سے اُسی طرح واقعیت حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں جیسا کہ اوپر چیزوں کو دیکھتے بھالتے اور جانتے ہیں۔ تجربات تمام ہی جلا واسطہ ہوتے ہیں اور ہرگز اس دنیا سے متعلق معلومات پر ان کی کامیابی منحصر ہے۔ اسی طرح مذہبی جذبہ کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ ہم ذاتِ خداوندی کے علم کی کماں تک ترجمانی کر سکتے ہیں۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ صوفیانہ تجربہ جہیں بحیثیت مجموعی کسی آفاق مسئلے کا جواب ہم پہنچاتا ہے۔ اس میں جزوی طور پر اُن کی سائنسی توجیہ و تفسیر نا عیب ہے۔ بحیثیت مجموعی و حل درست ہوگا اور ہو سکتا ہے مدتوں بعد یا کچھ عرصہ بعد ہی سائنس بھی اُس کا جواز اپنی پوری تفصیل سے مرحلہ بہ مرحلہ پیش کر سکے لیکن اس وقت وہ روحانی تجربہ بحیثیت مجموعی مختصراً صحیح متزل کی نشاندہی کر دیتا ہے۔

۳۔ تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ تعویف کی حالت ایسے لمحات ہوتے ہیں کہ اُن میں صوفی بزرگ کو ذاتِ باری سے استوار رہے کا قُرب حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی ذات پر بھی ذاتِ باری ہی کو حاوی دیکھتا ہے۔ اور اس طرح الٰہیاتی رہبری ہمارا واسطہ پکڑتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس حقیقت کا کھوج ہیں ملتا ہے جس کے ہم مستلاشی ہوتے ہیں۔ مغترضین کے لئے ایسا ہی بناوینا کافی ہونا چاہیے کہ آخر ہم اپنی دوزخہ کی معاشرتی زندگی میں اوروں کے دل کی بات بھی تو بوجھ لیتے ہیں۔ یہ امر اُن کے اطوار، عادات، اور منشا وغیرہ کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی رضا اگر کسی صوفی پر بشارت کے ذریعے واضح ہو تو ایسا ممکن کیوں ہو سکتا ہے۔

۴۔ چوتھا صوفیانہ تجربہ صرف محسوس ہو سکتا ہے اور کوئی واضح خیال نہیں ہوتا لہذا اُس مرحلہ میں اسے اوروں کو بتایا نہیں جا سکتا صوفی یا پیغمبر اپنے مذہبی شعور کی جس طرح ترجمانی کرتا ہے وہی تجاربہ دیگر لوگوں کے سامنے رکھی جا سکتی ہیں لیکن اصل جذبہ یا محسوسات بتائی نہیں جا سکتیں یعنی

ظاہر ہو اگر مذہبی احساس اور خیالِ اخلاقی تجربہ کے ہی ابدی اور مادی یا دنیاوی پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں اگر کوئی ضرب اچانک لگے تو ہم پہلے تو دم بخود ہو کر رہ جاتے۔ یہ ہیں کوئی تکلیف محسوس ہوتی ہے ذہنی پر چلتا ہے کہ ہوا کیا ہے اور پھر بھی ہیں اس چیز کا احساس ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ ہوا تجربہ ایک لمحہ کے لئے ذہنی خود کی تاریکی میں احساس بن کر چھپا رہا ہے یہاں تک کہ خیال اُس سے ہلکتا رہتا ہے اور صحیح حیثیتِ واقعہ ہوتی ہے۔ غماص مگر یا احساس خیال سے ہلکتا رہ کر اپنی تقدیر کو پالیتا ہے جو اپنے لئے کوئی مخصوص لمباہ اور ٹھکانہ سوسائٹی کے سامنے آتا ہے اور اس طرح بنی نوعِ انسان اُس سے آگاہ ہوتے ہیں۔

۵۔ مرنی کے ابدیت یا ذاتِ باری تعالیٰ سے استعنائی قُرب کے تعلق کی وجہ سے اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیاوی وقت کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ اس تصور کے تجربہ کے وقت اس دنیا میں اور اس میں جاری دوسری وقت سے اپنا تعلق اُس مرحلے کے لئے توڑ لیتا ہے۔ بلکہ ایک مخصوص طریقہ پر یہ تعلق قائم رہتا ہے۔ یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ سو فیاض تجربہ یا وجد یا (THAWING) کا مرحلہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے اور مرنی اور پونہ دونوں دوبارہ اپنی عام زندگی میں واپس آجاتے ہیں۔ البتہ مرحلہ اپنا ایک گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

پس ظاہر ہو اگر اصولِ معلوم کے سلسلے میں سو فیاض تجربہ بھی اتنا ہی واقعی اور ماضی ہے جتنا کہ کوئی اور تجربہ ہو سکتا ہے۔ بین جہاں جدید سائنسی معلومِ وسیعہ کے ذریعے جن کا تعلق ذہنی شعور یا (INTELLECT) سے ہے ممکن طور پر استفادہ کرتا ہے اُس کے ساتھ ساتھ مذہبی تجربہ یا سو فیاض سوچ بچار جو استعنائی مذہبی جذبہ اور غلاخِ نوعِ انسانی کی بنیاد پر کی جائے سے بھی استفادہ کرتا ہوا ماضی ہے۔ اگر نوعِ انسانی کو اتنے پیغمبروں اور مرنیوں نے اس مذہبی

سے فائدہ پہنچایا ہے تو ہم کیوں کُفرانِ نعمت کرتے ہوئے اس سے انکار کریں۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دنیا کے اور انسان نے جتنی ترقی کرنی تھی کر چکے تب تو ایسا سمجھنا شاید درست بھی ہو۔ لیکن یہ خیال انتہائی غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں یہ پیغام دیتا ہے کہ کائنات میں ہر نسل تبدیلی آتی رہتی ہے۔ بنی نوعِ انسان بھی تعمیر کے مرحلوں سے متواتر گندہا ہے اور جتنی ترقی بھی ہم نے کی ہے اُس سے نہیں معلوم کتنی ہزار گنا ترقی ابھی مزید کرنی ہے۔ لہذا مبدیہ سائنسی کلام کے علاوہ روحانی تجربہ یا تصوف کے تجربہ کا دامن چھوڑ دینا جو ہمیں مکمل حقیقت تک تھوڑے سے عرصے میں پہنچا دیتا ہے، صحیحاً غلط ہے۔

غوشِ قسمتی سے ہمارے پاس ایسی آزمائشیں ہیں جن پر ہم ان روحانی تجربوں کے نتائج کی جانچ پڑاں کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک ذہنی شعور کی آزمائش ہے اور ایک اُسے عملِ جاہلہ پسند کر دیکھنے کی آزمائش ہے۔ ذہنی شعور کی آزمائش سے مُراد تنقیدی تفسیر ہے۔ یعنی جدید علوم کی روشنی میں اُس کے تنقیدی جائزے کی کوشش کی جائے۔ عملِ جاہلہ پسند کر دیکھنے کی آزمائش سے مُراد یہ ہے کہ اُن تجاویز سے جو فائدے ہوتے ہیں انہیں پرکھا جائے کہ آیا یہ واقعی بنی نوعِ انسان کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ ان کوششوں پر پورا اُترنے والی روحانی تجربے پر محمول تجاویز کو قابلِ قبول سمجھنا چاہیے چونکہ اُن میں شیطان کی طرف سے کسی غلط دہرہری کی مداخلت نہ ہوگی جس کا امکان بعض دفعہ ہو سکتا ہے۔ الغرض روحانی تجربے سے انکار یا اُن کے پیش کئے ہوئے مفادات سے سراسر مستغنیہ نہ ہونے پر اصرار ایک ناقابلِ فہم بات ہوگی۔

رُوحانی تجربے کا منطقی جواز

ایک ہمہ گیر تجربے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی ایک وہ حصہ جس کا تعلق مادہ سے ہے اور دوسرا وہ حصہ جس کا تعلق روح سے ہے۔ مادہ سے جدید سائنسی علوم یعنی فرکس کیمیشری، حساب وغیرہ تعلق رکھتے ہیں اور رُوح سے مذہبیات کا تعلق ہے۔ اگر یہ نظریہ اختیار کیا جائے کہ صرف جدید سائنسی علوم یعنی فرکس کیمیشری حساب وغیرہ ہی سچے کا تعلق مادہ سے ہے، حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں اور رُوح یا مذہبیات کسی طرح حقیقت کی نعمی ہیں تو یہ نظریہ صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر یہ نظریہ اختیار کیا جائے کہ صرف رُوح اور مذہبیات کے ذریعے ہی حقیقت کو پایا جاسکتا ہے اور یہ کہ جدید سائنسی علوم جو مادہ پر مبنی ہیں کہیں کوئی معنی نہیں رکھتے یا یہیں حقیقت کی طرف لے جانے کی بجائے غلط راستے پر ڈالتے ہیں تو یہ بھی صحیح نظریہ نہ ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مادہ اور رُوح دونوں ہیں حقیقت کی راہ ہی دکھاتے ہیں۔ ان دونوں حصوں پر مبنی علم بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مل جاتے

ہیں اور یکساں نتائج اخذ کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مختلف سائنسی علوم بہت سے گروہوں کی انہد میں جو فطرت کے مژدہ جسم پر لوٹ پڑتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اُس کے گوشت کا کچھ کھڑا لے اُڑتا ہے۔ ان سب گروہوں کو یکساں رکھ کر دیکھا جائے تبھی اصل حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ گویا حقیقت کے ہر گروہ علم کی یہ علوم مختلف شاخیں ہیں جنہیں مختلف سائنسی علوم نے ایک ایک کر کے تخصیص کے ساتھ اُس میں صارت حاصل کی ہے یعنی (Specialization) کیا ہے۔ اس کے برعکس مذہبیات جس کا تعلق روح سے ہے مکمل حقیقت تک یکساں طور پر جس پہنچاتی ہے اور اس طرح جملہ سائنسی علوم کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اور دونوں قسم کے علوم کو ایک دوسرے سے خائف ہونے کی کوئی وجہ جواز نہیں۔

ماوہ پرستی کی دوز میں ہم اس قدر سرگرم ہیں کہ اپنی روحانی قوتوں کے بارہ گرد جو ہمارے اندر ہی موجود ہیں ایک پروہ سا ڈال دیتے ہیں جو ہمیں ان قوتوں سے بے گناہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ صرف امتداد ہے کی عبادت۔ ریاضت یا یوں کہہ لیجئے کہ مذہبی جذبے سے سرشار سوچ ہی ہے جو ہمیں ہماری خودی کی گہرائیوں یا روحانی گہرائیوں تک پہنچا دیتی ہے اور ہم حقیقت کو یسوی صبح راستے کو پالیتے ہیں۔ گویا مذہبی تجربہ یا روحانی تجربہ جو ظاہر ہے کہ ایک نہایت نیک جذبے سے کیا جائے اور جس میں بنی نوع انسان کی بھلائی مختصر ہوگی صحیح مقام کے لئے یعنی اپنی منزل معلوم کرنے کے لئے ایک (Shortcut) ہے۔ اس کے ذریعے مشکل اور آفاق مسائل کے بنے بنائے حل روحانی طور پر جتنی یا نہتہ بندگان کو مل جاتے ہیں۔ ان حلوں کا کوئی سائنسی جواز ہم فوراً پیش کر سکیں یا نہ پیش کر سکیں لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ وہ حل درست ہیں اور آئندہ چل کر کسی مرحلہ پر ان کا سائنسی جواز بھی معلوم ہو جاتا ہے جو سائنسی دیرینہ ہی کی بنا پر ہوتا ہے اور اس طرح مذہبی تجربے اور سائنسی علوم کی یکسانیت کا ثبوت بھی ہم پہنچتا ہے۔

پڑانے نہانے میں یعنی جب جدید علوم نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی روحانی ترقی کی مثالیں اکثر و بیشتر سامنے آتی تھیں۔ پیغمبروں کے دُرد کے علاوہ مَرنِیا اور دیگر بزرگوں کی آمد اُس دُنیا کے مختلف خطوں میں اِس امر کا ثبوت ہے، اِس کا جواز یہ ہے کہ بنی نوع انسان کا شعور اور ہوشِ بیدار یعنی (۱۷۳۷۷۷۷۷۷) تب اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مادہ کی دیرِ چ کی بنا پر یعنی جدید سائنسی علوم کے سہارے ہم تسخیرِ فطرت کا عمل جاری رکھتے۔ جدید سائنسی علوم اِس ترقی یافتہ حالت میں عیا کر اب ہیں تب نہ تھے۔ لہذا روحانی ترقی کا راستہ اختیار کیا گیا اور پر خلوص ریاضت اور بنی نوع انسان کی فلاح کے جذبے سے مبرور سوچ بچار کی قوتوں کو متکل طور پر بروئے کار لایا گیا۔ مجاہد پیغمبروں کی زندگی میں طویل السیادہ ریاضت اور سوچ بچار کے مرحلے ہیں عیس گے جن کے بعد بنی نوع انسان کی نجات کی راہ اُنہیں دکھائی گئی۔ یہ پیغمبروں ہی کا حصہ ہے کہ صحیح راستہ پالینے کے بعد انہوں نے اِسے اپنے آپ تک محدود نہ رکھا بلکہ تجربے کے لئے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا۔ اُس کی مثالوں کے زخم اُٹھائے لیکن صبر و استقامت سے اپنی نیک راہ پر قائم رہے۔ اور بالآخر انسان کی تقدیر پلٹنے کا باعث بنے۔ مرنِیا اور بزرگوں کی روحانی ترقی کا راز بھی ریاضت، عبادت اور سوچ بچار ہے اس کے علاوہ پیغمبروں کی تعلیمات بھی اُن کے سامنے بھتی ہیں۔ اُن کی مددِ شنی میں وہ ان تعلیمات کی صحیح تفسیر پیش کرتے ہیں۔ اور تھی نئی لون صدقوں اور مسائل کا حل اپنی سوچ بچار اور نیک جذبے کے نتیجے کے طور پر دُنیا کے سامنے لاتے ہیں۔ البتہ اُن کا مرتبہ پیغمبروں سے کم ہے چونکہ پیغمبر تو کسی مذہبی کتاب کی تفسیر کا باعث نہیں بنتے بلکہ اس پر تو ایک متکل ضابطہ حیات ہمارے سامنے پیش کر کے نئے حالات کچھ مطابق میں مُنہری راستہ دکھاتے ہیں پس مذہبی یا روحانی تجربے سے انکار صرف اِس وجہ سے کہ اب جدید علوم بہت ترقی کر چکے ہیں غلط ہے۔ ہو سکتا ہے اب روحانی تجربے کی ضرورت ہیں

کم محسوس ہوتی ہو چونکہ جدید سائنسی علوم اکثر و بیشتر ہماری مدد کو حاضر ہوتے ہیں لیکن ان کے روحانی تجربے کی موجودگی میں ممکن بلکہ ضروری اضافی امر ہے۔ اور یہ دونوں قسم کے تجربے ایک دوسرے کے نفی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے نتائج کے لئے اثبات کی صورت پیش کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی جابجائی پر تامل ان سے کی جا سکتی ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں اگر تجربے کے باطنی اور روحانی حصے کا فلسفیانہ دلائل کی مدد سے میں تجربہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اصل حقیقت یعنی الہیت ایک منطقیانہ طریقہ پر چلائی گئی تخلیقی زندگی ہے۔ اس زندگی کی الہیاتی خودی کے طور پر توضیح کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو آدمی کی شکل دی جا رہی ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے کہ کوئی بھی اُس کی برابری کرنے والا نہیں۔ وہ سُنتا ہے اور دیکھتا ہے: "کوئی بھی خودی قدرت کے یکساں اُصولِ قدرت کے بغیر نہیں ہوتی۔ قدرت یا *God* (نبیجہ) الہیاتی خودی کے لئے وہی درجہ رکھتی ہے جو کواڈر انسانی خودی کے لئے رکھتا ہے۔ اس طرح علامہ اقبال نے جو نظریہ قائم کیا ہے اُس سے طبقاتی سائنس کے ایک نئے روحانی معنی نکلتے ہیں نبیجہ یا قدرت یا فطرت کا حصول علم اللہ تعالیٰ کے ہاتھ یا اُصول کے بطور حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ قدرت کے مطالعہ کے وقت ہم الہیاتی خودی سے شناسائی حاصل کر رہے ہوتے ہیں اور یہ عبادت کی ایک اور شکل ہے پس علامہ اقبال ثابت کرتے ہیں کہ باطنی تجربہ اور روحانی تجربہ ایک ہی تجربے کے دو حصے ہیں اور ایک دوسرے سے غلط غلط ہوتے نظر آتے ہیں۔

قانونِ قدرت ہے کہ ہر چیز میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ گویا الہیاتی خودی تبدیلیوں کا منبع ہے۔ لیکن اس تبدیلی سے یہ بُرا نہیں کہ تبدیلی متغیر کی طرف ہو۔ تخلیق کلدوائی سے مُراد یہی ہے کہ ہر لمحہ تخلیق کا عمل جاری ہے اور بہتر سے بہتر صورت حال تائیدِ ایزدی سے اس کائنات میں

وجود میں آ رہی ہے۔ لہذا انسانی خودی پر بھی لازم ہے کہ ہر لحظہ بہتر سے بہتر صورتِ حال کے لئے کوشاں رہے کسی ایک منزل کو حاصل کرنے کے بعد اُسی کو آخری منزل نہ سمجھ لیا جائے بلکہ نئی سے نئی تعمیری منزلیں اپنے پیش نظر رکھی جائیں اور پہلے سے زیادہ بلند مطلع نظر ہونا چاہیے۔

پس تجرباتی واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ حقیقت کی اصل صورت روحانی ہے اور اُسے ایک خودی کے طور پر ہی سمجھنا چاہیے لیکن مذہب کی توقعات فلسفہ کی توقعات سے بلند تر ہوتی ہیں۔ فلسفہ اشیا کا ذہنی یا شعوری جائزہ لیتا ہے اور اس طرح تجربہ کی وسیع آماجگاہ کو ایک محدود سسٹم یا فارمولہ میں لے آئے سے آگے نہیں بڑھتا۔ گویا حقیقت کو ایک فاصلے سے دیکھتا ہے۔ مذہب حقیقت سے انتہائی قُرب کا رشتہ پرست کرتا ہے۔ فلسفہ کو آپ تیسری سمجھیے اور مذہب کو گنہگار تجربہ اس قُرب کو حاصل کرنے کے لئے عبادت یا ریاضت یا اولی جذبے سے بنی نزع انسان کی بھلائی کے لئے سچے پکار کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسانی شخصیت کی بے پناہ قوت

ملازمہ اقبال نے انسانی شخصیت یا بخودی یا انکی قوتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لانے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور اپنے خیالات میں جگہ جگہ اس نکتہ کو ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اپنی ذاتی محنت، شاقہ، جدوجہد مسلسل اور زیرکی سے اس دنیا بلکہ کائنات کا مشکل سے مشکل مرحلہ انسانی گرفت میں آسکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ انسان شروع و قوتوں اور مشکلات سے کسی طرح ہمت نہ ہارے بلکہ زیادہ سے زیادہ جوش و ہمت اور قابلیت سے قدم آگے کی جانب ہی بڑھائے اور اس امر پر یقین رکھے کہ کامیابی اُس کا مقتدر بن کر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شخصیت یا بخودی کی قوتیں عطا کر کے ایسی عظیم عنایات کی ہیں کہ ہم انہیں بروئے کار لا کر خود اپنی اپنے خاندان کی، اپنے ملک کی بلکہ ساری دنیا کی قسمت ہی بدل کر رکھ سکتے ہیں۔ بس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں فرمایا کہ بلاشبہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ہر پہلو کو تجویز کیا کہ بارائمت (شخصیت کا) اٹھائیں لیکن انہوں نے اس رجحان کو اٹھانے سے انکار کیا۔

کر دیا مادی نے یہ وجہ اٹھانا منظور کیا لیکن وہ غیر منصف اور کم عقل ثابت ہوا۔ قرآن حکیم میں مزید آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر اپنی جگہ کسی کو جوہر یا پتھر کے، بھیجنے والا ہوں۔ اس پر فرشتوں نے عرض کی کہ کیا تو ایسی مخلوق کو وہاں بھیجے گا جو وہاں ہی پھیلائے گی اور خون بہائے گی۔ جب کہ ہم تیری مدح اور ثنا خوانی کے لئے موجود ہیں اللہ تعالیٰ نے جواب دیا بلا شک میں جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اور میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں یعنی انسانوں کو اس دُنیا میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ پس ظاہر ہوا کہ انسان اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب یا نمائندہ ہے اُسے شخصیت یا خودگی کی بے پناہ قوتیں تفویض کی گئی ہیں جنہیں بروئے کار لاتے ہوئے اُسے اللہ تعالیٰ کی صفات اپنے آپ میں پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے جن کا جگہ جگہ ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ اگر انسان مکمل طور پر ان صفات کے حصول اور تسخیر کا ثبات کے سلسلے میں جبر مسلسل نہیں کرتا۔ اگر وہ عمل و انصاف سے کام نہیں لیتا۔ اگر وہ عقل و شعور کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتا تو وہ ظالم یا جاہل نہیں تو اور کیا ہے۔ منصوصِ حق نے اگر ان اہل حق کا غرہ لگایا یا دیگر مٹوئیے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا غمناک ہو یا یہ کہ خدا کی کوئی ہستی نہیں بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا میں جس اپنا نائب بنا کر خلق کیا ہے کہ ہم اُس کی صفات کو اپنانے کے لئے اپنی پوری قوتیں اور صلاحیتیں بروئے کار لائیں اور اس طرح اپنی ذاتی جملہ انسانیت کی اور کائنات کی تقدیر بدل کر رکھ دیں مٹوئیے کے اقوال کو غلط مطلب پٹنایا جائے جس طرح پر نہ سمجھنا تو ہماری اپنی جمالت ہے۔ خیال کی جس معراج تک وہ لوگ یعنی مٹوئیے پہنچ گئے اگر ہم لوگ وہاں نہ پہنچ سکیں تو اس میں ہمارے اور کس کا قصور ہو سکتا ہے۔ اگر اپنی شخصیت یا خودگی کی بے پناہ قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دُنیا میں اپنا نائب بنانے وقت مرحمت

کہیں ہم کام میں نہ لائیں تو ہم جاہل نہ ہوئے تو کیا ہوئے۔ علامہ اقبال نے اس امر پر زور دیا ہے کہ صوفیاء کے اقوال کو (RATIONALISE) کرنا چاہیے یعنی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور محض اس وجہ سے کہ وہ صوفیاء کے اقوال ہیں اور آج کل صوفی ازم کا زمانہ نہیں انہیں رد کر دینا قرین انصاف نہیں چونکہ تاریخ اور مطالعہ قدرت کے ساتھ ساتھ اندرونی تگری سوچ بچار جو اللہ سے لوگ کر اس کی مخلوق کی فلاح کے لئے کوئی نیک شخص کرے، اُس میں بھی نیک مقاصد حاصل کرنے کے لئے منہایت اعلیٰ و ارفع ذریعے حیران کن حد تک موجود ہوتے ہیں۔ اُن کی سچائی کا بخاطر ثبوت یا توجیہ خود اُن کا زمانہ یا اُن کے بعد کا زمانہ بھی دے سکے یا نہ دے سکے لیکن اُن کی سچائی اور درستی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اور کہیں نہ کہیں اُن کی سچائی کی توجیہ ہمارے سامنے آجائے گی۔ گویا دیانت اور گہری سوچ بچار یعنی مگرنی ازم کے ذریعے اکثر اوقات کسی مشکل مسئلے کے بنے بنائے حل ایسے ملتے رہے ہیں جن کی تاریخ شاہد ہے اور علامہ اقبال کے لفظوں میں پیغمبری کی ایک جھلک سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ پیغمبری کا رتبہ اُن صوفیاء کو حاصل نہیں ہوتا۔ مگر ازم کے البتہ علامہ اقبال بہت خلاف ہیں اور مطلقیت سے اُن کی کڑاو ایسے نا سجد اور کم عقل مٹا ہیں جو ٹھائی میں سجدے کی اجازت ہونے کو ہی آزادی کے مترادف سمجھتے ہیں۔

مغربی مالموں نے بھی شخصیت اور خودی کے مشکل مسئلہ کو چھان بین کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اُن میں سے بریڈلے اور نیٹشے خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے جذبات کے باوجود خودی کے وجود اور ارتقا کو تسلیم کیا ہے۔ اُن کے اور علامہ کے عقائد میں جن کی بنیاد اسلامی اعتقادات پر ہے کافی فرق ہے لیکن انہوں نے اس بڑی حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ خودی کے ارتقا میں ہی فلاح انسانی کی تکمیل مُصنوع ہے مثلاً نیٹشے کا فلسفہ ہے کہ اس دنیا کے آثار کو پرِ مشا

سب بار بار آتے اور جاتے ہیں، ہر طرح کا مدد و جز جواب آتا ہے پہلے بھی اپنی باری پر اچکا ہے۔ گویا ہر بلندی اور پہنچ پہلے ہی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور اپنی اپنی باری پر ایک مشینیں انداز میں آتی اور جاتی ہے۔ حتیٰ کہ (SURERMAN) کی آمد و رفت بھی مشینی انداز میں جاری ہے اور اپنے وقت میں اُسے آتا ہی آتا ہے لہذا اُس کے لئے جد و جہد کیا کرنی۔ اس کے برعکس طور پر انسان کا فلسفہ یہ ہے کہ بلندیوں اور پہنچوں کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ ہماری جد مسلسل اور سستی تمام جاری رہنی چاہیے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ صرف انہی تک اکتفا کرنا مرد و مومن کی شان نہیں۔ گویا انسانیت کی تکمیل ابھی کسی مرحلہ پر بھی نہیں ہوئی اور یہ کہ نئی سے نئی بلندیاں اور ترقی کائنات کے نئے سے نئے پہلو و جد مسلسل کے نتیجے کے طور پر ہمارے متغیر ہیں۔ انسان کا زخم ہونے والا انعام اُس کی خودی کی بھرپور صلاحیتوں پر کنٹرول حاصل کر لینا ہے قیامت کا منظر بھی ایسے خود آگاہ شخص کے اعتماد اور یقین کو ہلا نہیں سکتا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں پیغمبر اسلام کی انتہائی بلندی پر پہنچ ہوئی خود آگاہی سے متعلق فرمایا ہے کہ اُس کی آنکھ ایک طرف کو نہ ہوئی اور نہ ہی اپنے راستے سے ہٹ سکی۔ اسلام میں مرد و مومن کی یہی شان ہے۔ ایک فادسی شاعر نے آنحضرت مسلم کے الہیاتی تجربے کو بہت خوب بیان کیا ہے۔

موسلی تو جوش و فتن بیک جلوہ مفتا

تو میری ذات می نگر می در تبسمی

(ترجمہ: حضرت موسیٰ صفت الہیہ کے ایک ہی جلوے سے بیہوش ہو گئے تو درمیان)

پیغمبر اسلام) تو خود ذات الہیہ کا پرتو ہے کہ اُسے دیکھ رہا ہے اور تبسم میں ہے)

دور رخ اور جنت کا تصور بھی اسلام میں اسی انداز سے آیا ہے کہ اُس سے شخصیت اور

خودی کے ارتقاء پر انسان آمادہ ہو۔ دور رخ سے یہ مراد نہیں کہ ہمیشہ کے لئے کسی دیکھے ہوئے

کنوئیں میں کسی بد انسان کو زوال دیا جاتا ہے جہاں سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باہر نہیں نکل سکتا۔ بلکہ اس کا مفہوم بھی اسی ہے۔ یہ سزا کا ایک *Period* یعنی وقفہ ہے جس میں بد کردار انسان اپنی شخصیت کی صلاحیتوں کو صحیح طور پر قابو میں لانے کے قابل بن سکتا ہے۔ اسی طرح جنت بھی کوئی ہمیشہ کی ٹمپٹی نہیں۔ ہماری جہد کا میاں یہاں جو ہماری خود آگاہی کے بعد جذبہ سے حاصل ہوتا ہے نئی نئی سے نئی خوشیاں اور اطمینان ہمارے لئے پیدا کرتی ہیں اور اس طرح نئے سے نئے کامیاب قدم اٹھانے پر ہمیں انگڑائی ہے۔

سپینسر *SPENCER* نے اپنی کتاب (*DECLINE OF THE WEST*) میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ قرآن نے انسان کو تقدیر کے تابع کر کے خودی کا فائدہ کر دیا ہے۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ اسلامی اور قرآنی نظریہ تو اس کے بالکل برعکس ہے۔ تقدیر سے مراد یہ ہر گز نہیں کہ ہر شخص کی اچھی یا بُری قسمت اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل سے لکھ دی ہے اور اُسی کے مطابق اُسے اچھائی یا بُرائی بیٹنی ہے۔ اس قسم کا نظریہ تو اُنموہوں نے بھی حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد پھیلا یا تھا کہ کربلا کے واقعات میں اُن کا کیا قصور ہے تو اللہ میاں کی طرف سے روزِ ازل اُن کی تقدیر میں لکھا گیا تھا۔ اگر یہ نظریہ مان لیا جائے تو پھر سزا و جزا کا مسئلہ کس طرح جانچ ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ خود ہی ہمارے اچھے اور بُرے اعمال کے لئے ذمہ دار ہے تو پھر ہمیں اچھے اعمال کی جزا کیوں ملے اور بُرے اعمال کی سزا کیوں ملے۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ کی طرف سے کوئی قسمت لے کر ہم پیدا نہیں ہوئے۔ نہ ہی کسی اچھے یا بُرے وقت کا پہلے معاوضہ ملے ہے۔ یہ ہمارے اپنے اعمال، محنت، قابلیت اور خودی کی قوتوں کو بردے کا ر لانے اور زیر کی کے استعمال پر منحصر ہے کہ اچھے یا بُرے واقعات مُدنا ہوتے ہیں جن کے لئے ہم لوگ ذمہ دار ہیں۔ تقدیر کی قرآنی وضاحت محض یہ ہے کہ اگر ہم جبرِ مسلسل سے کام لیں

اور غور اگا ہی اور خود شامی کے میدان میں پیغمبر اسلام کی پیروی کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بڑی سے بڑی مشکل پر قابو نہ پالیں اور ذاتی طور پر بحیثیت مجموعی انسانیت کو ایک نہایت ارفع و اعلیٰ مقام پر نہ پہنچادیں۔ اسلام کو سب سے بڑا نقصان اُمویوں کے اس نظریہ تقدیر نے پہنچایا جو اُنہوں نے قتلِ حسینؑ و حسنؑ کو جائز قرار دینے کے سلسلے میں کئے۔ ملائم اقبال نے اسلام کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں زیرِ نظر مقالے میں ان اُمور کی بھرپور سی کی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ انہی کے اندرِ قلم کا نتیجہ ہے کہ آج ہم آہستہ آہستہ لیکن ایک عزم کے ساتھ جہالت کی اُس تاریکی سے نکل کر ترقی و تعمیر کی راہ پر گامزن ہیں۔

نظریۂ اجتہاد

اسلام میں زندگی کی بنیاد روحانی ہے جس میں ابدیت اور تغیر کے اجزا باہمی طور پر پوست ہیں۔ ایک معاشرہ جو اس حقیقت پر مبنی ہو اُسے ابدیت اور تغیر کی اس حقیقت کو پہچان کر اُس سے مکمل طور پر استفادہ کرنا چاہیے۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ ابدی اصول کسی قسم کے تغیر کو برداشت نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تغیر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے، تو یہ معاشرہ آگے کی طرف بڑھنے اور ترقی کرنے کی بجائے اپنی جگہ ہی جم جائے گا بلکہ اس میں تنزل ہی کے امکانات پیدا ہوں گے اور ترقی کا دروازہ مسدود ہو کر رہ جائے گا۔

اجتہاد کے لفظی معنی ہیں جدوجہد کرنا۔ اسلامی قانون کی زبان میں اس کے معنی ہیں کسی بھی قانونی معاملہ میں آزادانہ اور صحیح رائے قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا کہ وہ لوگ جو سنت کو شش کرتے ہیں، انہیں ہم اپنا صحیح راستہ دکھاتے ہیں جب رسول مقبول نے حضرت معاذ کو مین کاگو در مقرر کیا تو حضور کے استفسار پر معاذ نے کہا کہ میں

مسائل کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق کروں گا۔ حضور نے پوچھا: اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس امر سے متعلق کچھ نہ ہو تو پھر؟ اس پر معاویہ نے جواب دیا کہ تب میں پیغمبر اسلام کی کُشت پر عمل کروں گا۔ رسولِ مقبول نے پوچھا کہ اگر کُشت میں بھی اس امر کے بارے میں کوئی واضح حکم نہ موجود نہ ہو۔ اس پر معاویہ نے جواب دیا کہ اُس صورت میں میں اپنی بہترین رائے معلوم کرنے کے لئے مجتہد جہد کروں گا۔

پہلی چند صدیوں سے اسلامی ممالک تنزل کا شکار رہے ہیں جس کی ایک بڑی وجہ وہاں کے معاشرہ کے قوانین کی ٹوٹی پھٹی یعنی اُن میں کوئی حرکت یا آگے کی طرف بڑھنے کے لئے اجتہاد کا جذبہ موجود نہ تھا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

۱۔ عباسیوں کے زمانے میں اسلام میں منطقی احیاء کی تحریک شروع ہوئی اس طرح دو مخالف فرتے وجود میں آئے۔ ایک تو درآن کو ابدی تصور کو تاہم جسے قدامت پسند نظر پرکھا جاتا ہے۔ دوسرا فرقہ یعنی اسلام کے منطقی اور شعوری احیاء کا طبقہ اس سے اتفاق نہ کرتا تھا اور اسے عیسائیت کا اثر قرار دیتا تھا۔ عباسی خلفائے قدامت پسندوں کا ساتھ دیا۔ ایک تو اس وجہ ہی سے کہ اُن کے خیال میں اس تحریک سے اسلام کے بنیادی ڈھانچے ہی کے گر جانے کا اندیشہ تھا اور دوسرے اس وجہ سے بھی کہ اس سے شخصی حکومت پر زور پڑنے کا اندیشہ تھا کیونکہ اسلام کی اگر صحیح معنوں میں آزادانہ طور پر منطقی توجیہ کی جائے تو اس میں بادشاہت کی کوئی گنجائش نہیں چنانچہ منطقی احیاء کی تحریک کے علمبرداروں کو سختی سے گلے کی سس کی گئی۔

۲۔ رہبانیتی تصوف کے ارتقا سے جو غیر اسلامی اثرات کی بنا پر وجود میں آیا اسلام میں منطقی یا جدیدیت کے رجحان پر بہت بُرا اثر پڑا۔ رہبانیت کا اثر یہ ہوا کہ ٹوٹی بڑگ لیا شخص ہی مقصد ہونے لگا جو دنیا و مافیہا کو چھوڑ کر صرف اللہ ہی سے لو لگانے پر ہی ہرے کر

اُس کے خیال میں تو اشد کی کتاب پر مختلف توجہات کا مجموعہ نہ گذر نہیں تو اس سے کچھ کم سمیت ہی ہوگی۔ بظاہر ہے اس زاویہ نگاہ سے ترقی تو کیا ہوتی البتہ تنزیل کی راہیں کھل گئیں۔ انتقالِ بنی کی بجائے سُست الوجودی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

۳۔ بغداد کی تباہی نے وہی سہی کسر پوری کر دی۔ تانادیوں کے بغداد پر غلبہ کے بعد اسلام کی بقا سے متعلق نا اُمید ہیجت زیادہ بڑھ گئی۔ اس دور سے کہ اسلام کی اقتدار میں مزید برابری پیدا نہ ہو مسلمانوں نے یہ رویہ اختیار کیا کہ اسلام کی قدیم شکل کو جنوں کا توں محفوظ رکھنے کی کفایت سہی کی جائے اور اُس کے کسی پہلو پر کسی قسم کا بیرونی اثر نہ پڑنے دیا جائے۔ ندر کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کا جو حال تھا اور جدید سائنسی علوم وغیرہ سے جس طرح انہوں نے بائیکاٹ کئے رکھا بالکل وہی حال عربوں کا بھی تھا۔ اجتہاد کا دروازہ انہوں نے اپنے اوپر خود مکمل طور پر بند کر لیا یہاں تک کہ وہ ترقی کی دوڑ میں صدیوں پیچھے رہ گئے۔ وہ یہ سمجھ گئے کہ تنزیل کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود اعتمادی سے بھرپور اور جدوجہد کے لئے ہر وقت آمادہ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ مکمل طور پر بندھے ہوئے نظام کی جس میں سرسبز بھی فرق نہ کیا جاسکے مثلاً اگر پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد کالِ اناٹولک اپنے ملک کے احباب و ناکہ بیڑا نہ اٹھاتے اور اس سلسلے میں ترکی سوسائٹی کو جملے ہوئے حالات کے مطابق نہ دیکھتے تو ترکی قوم اپنی موجودہ حالت پانے کی بجائے بالکل ہی ختم ہو کر رہ جاتی۔ باقی پہلوؤں کو تو چھوڑیے خود خلافت کے موضوع پر ہی ترکی کی قومی اسمبلی نے جو اجتہاد کیا وہ خالی از و جہی نہیں۔ شئیِ تانازن کے مطابق کسی امام یا خلیفہ کا مقرر کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔ پہلا سوال اس سلسلے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خلافت ایک ہی شخص کے سپرد ہونی چاہیے۔ اس موضوع پر ترکی میں اجتہاد یوں ہوا کہ اسلام کی روح یہ ہے کہ خلافت یا امامت شخصِ واحد کی بجائے اشخاص کی

ایک جماعت کے سپرد کی جاسکتی ہے یا ایک ایسی اسبلی کو یہ بار سونپا جاسکتا ہے جو باقاعدہ طور پر چناؤ کے ذریعے مل میں آئی ہو۔ یہ رائے بالکل صحیحہ اور متوازن ہے۔ جمہوری طرز کی حکومت اسلامی روح کے عین مطابق ہے اس سے کبھی انکار ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے خلافت سے متعلق شرط یہ تھی کہ خلیفہ خاندان قریش سے تعلق رکھتا ہو۔ شروع میں یہ شرط ضروری تھی چونکہ اسلام کے بانی مہدیان اور جسے بڑے علمبردار اہل قریش تھے لیکن بعد میں جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور بادشاہت دوسرے ملکوں اور خاندانوں میں چلی گئی تو خلافت کے عہدہ کا جسم رکھنے کے لئے اس اصول میں یوں ترمیم کی گئی کہ جو اسلامی ملک سب سے زیادہ طاقتور ہو وہیں کا حکمران خلیفۃ المسلمین مانا جائے۔ گویا اسلام کے بنیادی اصول کے ڈھانچہ میں فرق وئے بغیر باقی تفصیلات میں نشاء اور ضرورت کے مطابق ترمیم کی جانی جانی ہے۔ اس سلسلے میں باقی ہر دنیاوی مضامیر (EXTRINSIC) سے کام لینے کی ضرورت نہیں بلکہ (MODERATION) کا سنسری اصول لگ کر پیش نظر رکھا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس سلسلے میں ذیہ نظریہ درست ہے کہ اصول کی کسی بھی تفصیل میں ہر فرقہ لانا کفر ہے اور نہ ہی یہ نظریہ درست ہے کہ اسلام بنیادی اصول کا ڈھانچہ بھی تبدیل کر دیا جانا چاہیئے۔ ان دونوں کے مین مین یہ تدریس اصول ہی درست ہے جس کا ادر بیان ہوا۔

اسول فقہ کے تنقیدی تجزیہ سے متعلق علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل امور پیش کئے ہیں:-
 (۱) ہمیں یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ عباسی خاندان کے زمانے تک اسلام کا کوئی تحریری قانونی علاوہ قرآن حکیم کے وجود میں نہیں آیا۔

(۲) دوسرے یہ امر قابل غور ہے کہ پہلی صدی کے وسط سے تقریباً چوتھی صدی کی ابتدا تک کم و بیش انیس سکول اسلامی قوانین کی رائے سے متعلق وجود میں آئے صرف اسی سے ظاہر

ہوتا ہے کہ ہمارے اُس ابتدائی زمانے کے اسلامی قانونی ماہرین کیسے سرگرمی سے نئے نئے تقاضا کو پورا کرنے کے لئے اسلامی قوانین کے تنقیدی جائزہ پر مصروف کار تھے۔

(۳) جب ہم اسلامی قانون کے چار مانے ہوئے مواخذہ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بحث خود بخود ختم ہو جاتی ہے چونکہ ان مواخذہ میں سے ایک ہم ماخذ خود قیاس یا نظریۂ اجتہاد ہے۔ اب ہم اسلامی قوانین کے مختلف ماخذوں پر مختصر بحث کرتے ہیں۔

۱۔ قرآن :- اسلام کا بنیادی ماخذ قرآن ہے۔ بہر حال قرآن کوئی قانونی ضابطہ نہیں۔ اس کا برا مقصد یہ ہے کہ انسان میں ایک بلند تر شعور اس امر کا پیدا کرے کہ اس کا رشتہ اللہ سے اور کائنات سے کیا ہونا چاہیے۔ بلاشبہ قرآن عام اصول مندرجہ ترتیب کرتا ہے جنہیں قانونی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کی تفصیل بہر حال قانونی ماہرین ہی کو کرنی چاہیے جو اسلامی علم و فضل سے مکمل طور پر بہرہ ور ہوں۔ قرآن میں جگہ جگہ فطرت کے تغیر کا پتہ دیا گیا ہے اور ہمیں انسانی کی گئی ہے کہ ہم فطرت کے تغیر کا بغور مطالعہ کریں اور اُس سے مکمل طور پر استفادہ کریں۔ لہذا یہ امر نہایت غیر اسلامی ہو گا کہ ہم تغیر کے لفظ سے ہی گھبرائیں۔ آخر ترقی و تعمیر میں بھی تو تغیر ہی ضرور ہے۔

۲۔ حدیث :- حدیث کی اہمیت کے پس منظر میں یہ امر ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امتیازی احکام ایک خاص سوسائٹی اور زمانے پر آزمائے تھے اور انہیں اُس وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا تھا۔ اسلام کے نئے سے نئے انگوں میں پھیلنے اور ہر نئے زمانے کے تغیر سے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان اصولوں کی تفصیل میں مناسب رد و بدل اور ترمیم لازمی ہو جاتی ہے ورنہ اسے یعنی اسلام کو صرف ایک جگہ قہر و مجاہدہ کے لئے سوزوں سمجھا جائے گا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے مقرر کردہ مہین کے

گورنر مساؤ کو تعین کی کہ اگر اُس ملاقات کے حالات کے مطابق قرآن اور حدیث میں احکام موجود نہ ہوں تو اپنے آزادانہ فیصلہ پر عمل کرو جس کی بنیاد اجتماع نہیں تو اور کیا ہے۔

۳۔ اجتماع :- اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ اجتماع ہے یعنی اجتماع اتفاق رائے لیکن جس سے مراد نہیں کہ اجتماع اتفاق رائے اسلام کے بنیادی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی لاسکتی ہے۔ بنیادی ڈھانچہ یا بنیادی اصول وہی رہیں گے البتہ اُن کی تفصیل کے زمانے اور ملاقات کے تقاضوں کے مطابق ہوں گی۔ اجتماع کے اسلام میں قانون کے اہم ماخذ ہونے سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام موجودہ جمہوری پارلیمانی نظام کے حق میں ہے۔

۴۔ قیاس :- فقہ کا چوتھا ماخذ قیاس ہے۔ اور اس سے مراد یہی ہے کہ اسلام کے بنیادی تقاضوں کے مطابق اپنی آزادانہ رائے کا استعمال کیا جائے اور نئے اصول وضع کئے جائیں۔ یہی اجتماع کا بنیادی اصول ہے۔

پس ظاہر ہوا کہ اجتماع اسلامی معاشرہ کی ترقی و ترقیر کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اگر اجتماع کے دروازے ہم پر بند کر دیئے گئے تب تو اس سے مراد یہ ہوتی کہ ہم اپنے ذہن و شعور کو زندگی لگا دیں۔ جدید علوم و فنون سے متاثر نہ ہوں چہ جائیکہ اُن سے استفادہ کریں۔ اور یہ کہ تنزل کی تاریکیوں میں مست رہ کر یہی سمجھتے رہیں کہ میں اسلام میں ہی ہے اور یہ کہ آخرت میں جنت الفردوس کے مزے ہمارے ہی لئے مخصوص ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسلم کلچر

مسلم کلچر اور ثقافت کے بنیادی اُصولوں کی (RATIONAL INTERPRETATION) منطقی توجید و تشریح جسے عقل و دانش کی کسوٹی پر صحیح طور پر پرکھا جاسکے، جس شاندار طریقے پر علامہ اقبال نے کی ہے وہ اس کا حصہ ہے۔ اسلام میں مذہبی افکار کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں ان کے لیکچر ہیں اسلامی کلچر کی صحیح روش سے آگاہ کرتے ہیں۔ ایک تو ہم خود صدیوں سے ہر قسم کی انقلابی تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی ہستی کے تعیر گناہ میں جا گرے تھے خود ہم میں اس قدر احساس کمتری جاگزیں ہو چکا تھا کہ ہم ممکن طور پر یہ فرض کئے ہوئے تھے کہ اسلامی کلچر اور مذہب یوں ہی کلچر اور مذہب کے مقابلے میں ایک غنایت ہی کتر قسم کی چیز واقع ہوئی ہے تبھی تو ہم ان کے ہاتھوں رنگ اُٹھائے ہوئے ہیں اور یہ کہ خدا نخواستہ یورپی اقوام۔ تہذیب و مذہب کسی طرح ہمارے کسی آسمانی غنایت کے باعث بہت اعلیٰ داخل میں اور یہ کہ ہماری قسمت ہی میں غوری اور بے چارگی ہے تبھی تو ہم ذلیل و خوار ہیں۔ پھر خود یورپی اقوام نے جن کا کلچر ہی میں اقوامی اعتبار

نوابا دیت اور نسل امتیاز چھٹی ہے، اپنے زیر پرے اور گمراہ کن پراپیگنڈہ سے اپنی غلام قوموں کو بے باور کرانے کی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی کہ یورپ کا کلچر ہر لحاظ سے اسی وارث ہے مگر اقبال کی مساعی نے جسے جہاد کا نام ہی دیا جانا چاہیے یہ ثابت کر دیا کہ قدیم یونانی فلسفہ ہو یا حبید یورپی کلچر، اسلامی اقدار اور کلچر کے مقابلے میں پیچ ہیں۔ اور ہیں اپنی فراخوش کردہ اقدار کے نزدیک انہوں کو وہ بدہ پاکر از سر نو ایک نئی اسلامی معاشرہ کی تشکیل پر زور دینا چاہیے تاکہ ہم اپنا گویا ہوا اقدار اور گذشتہ عظمتیں سب حاصل کر سکیں۔ انہوں نے مذہب اسلام کی حیات پر مبنی تشریحات کی وجہ سے اثرائیں چاہے وہ ہمارے اپنے مسجد طلاق پھیلائی ہوئی تھیں یا یورپین عیاروں کی کم فنی یا وہ وہ دانتہ دودھ گئی کا خیر تھیں جن سے انہیں خود اپنے مقاصد حاصل کرنا مقصود تھا۔

سب سے پہلے میں کلچر کی تعریف متعین کر لینی چاہیے۔ کلچر کا لفظ بہت عام استعمال میں آتا ہے لیکن بعض دفعہ بہت کم اس کا مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ کلچر کے دو کثری معنی ہیں ایک قسم کی تمدن۔ اس قسم کی توضیح یوں ہوئی کہ ایک معاشرہ جس قسم کے بنیادی اخلاقی، بین الاقوامی، اقتصادی، علمی اور مذہبی اصولوں پر قائم ہے وہ اس کلچر کی بنیاد ہوئے اور ان بنیادوں پر قائم معاشرہ میں جس قسم کے روابط باہمی اور ترقی و تعمیر کے وسائل ملک کے اندر اور ملک کے باہر پیدا کئے جاتے ہیں وہ اس ملک کی تہذیب ثقافت یا کلچر ہوئے۔ کسی ملک کے مختلف طبقوں میں معاشی اور سیاسی مساوات ہے یا نہیں۔ دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات انصاف اور برابری پر مبنی ہیں یا نہیں۔ اقتصادی اور فوجی لحاظ سے ملک مضبوط ہے یا نہیں۔ اور کون سے طریقے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ سب امور اس قوم کے کلچر کا حصہ ہیں اور اسی روشنی میں ہیں اسلامی کلچر کا جائزہ لینا ہے جس کی صیح روح علامہ اقبال نے سنایت احسن طریقے سے پیش کی ہے۔

اسلام نے ہمیں نبوت کے خدائے کا پیغام دیا۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے تو والدین ہی اُس کے ہر قسم کے کام کرتے ہیں اُسے نسلانا، دُھلا نا، کپڑے پہنا نا، غرضیکہ اُس کا ہر قسم کا کام اُس کے والدین ہی کے سپرد ہوتا ہے۔ اِس کے بعد اُس کی تعلیم کا ناز شروع ہو جاتا ہے۔ تب بھی خرچ اُسے والدین ہی دیتے ہیں۔ اُس کی تعلیم میں بھی سکول کے اساتذہ کے علاوہ اُمید و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ سکول کے بعد کالج اور یونیورسٹی کا ناز آتا ہے اور اِس سب دور میں وہ والدین ہی کے دستِ نگر ہوتے ہیں اور متواتر اُنہی کی عنایات کی اُمید پر اُن کے دن گزرتے ہیں۔ پھر اُن کی تعلیم ختم ہوتی ہے اور سروس یا کوئی اور کام کاج ڈھونڈنے کا وقت آتا ہے۔ تب بھی وسائل کے نہ ہونے کی پریشانی کے باعث وہ والدین پر ہی بوجھ رہتے ہیں اور اُن کی عنایات کے صدمے ہی دن گزرتے ہیں۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُنہیں مکمل طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر اُنہیں والدین ایسا کرنے پر مجبور نہ کریں تو خود اُن کی زندگی ناکامیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا مجموعہ بن جائے گی اور کئی پکانی نصرتوں کی متواتر اُمید اُن کے لئے نصرت نہیں بلکہ ایک تباہ کن اور مملکتِ حادثہ بن جائے گی۔ یہ اصول نہ صرف انسانوں میں بلکہ جانوروں میں بھی ملاحظہ کیا گیا ہے۔ گتیا اپنے لونو لو بچوں کو کس ماز و نعم سے پرورش کرتی ہے۔ اُنہیں جو متنی چاہتی ہے۔ اُن کی حفاظت کرتی ہے۔ اُنہیں خوراک بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن جو نئی وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی چمٹے رہنے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے تو گتیا اُنہیں مار پیٹ کر بڑی سختی سے الگ کر دیتی ہے۔ باقی جانوروں میں بھی یہی کیفیت دیکھی گئی ہے۔ انسانیت کی ابتدا سے ظہورِ اسلام کے زمانے تک انسانیت بھی یوں سمجھی کہ اپنے بچپن کے زمانے سے گزردہ ہی تھی۔ اُس میں اِس عقل و دانش ابھی پیدا نہ ہو سکی تھی کہ وہ

منہ پر غرور نہ کرنا اور پانے کی سکت اپنے آپ میں پانی چنانچہ مختلف پیغمبر مختلف زمانوں اور ممالک میں بھیجے گئے تاکہ وہ انسانیت کے لئے اُس کے خالق کی طرف سے رہبری کریں اور اس سلسلے میں مُرتبہ اُممیں و مضابط اُن تک پہنچائیں۔ اس طرح متواتر رہبری اور رہنمائی کے بعد بالآخر ہمارا اُس کے حضور تک اللہ تعالیٰ نے اپنی رہنمائی کی تکمیل کر دی قرآن کی ترسیل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں رہبری کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رکھا گیا اور نبوت کے خاتمے سے یہ پیغام دیا گیا کہ اب انسانیت کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا وقت آچکا ہے۔ اُس کی تربیت اور رہبری مکمل ہو چکی اور اب خود اُسے اپنی محنت و مشقت اور اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر خود اپنی ترقی و تہذیب کی تکمیل کرنی ہے۔ اور کسی بھی رہبری و رہنمائی کی مزید کسی اُمید پر مبنی نہیں رہنا ہے۔ سو نبوت کے اِس خاتمے کی تصدیق سے اگر کوئی مسلمان یہ سمجھے کہ نبی آخر الزماں ہمیں یہ نہایت دے گئے ہیں کہ اِس دُنیا اور آخرت میں اب وہی ہمارے رکھوالے اور میلاں ہیں اور یہ کہ ہمیں اُممیں کی فہمی اعداد پر ہمارا کئے ہوئے خود کچھ بہت نہیں کرنی تو یہ بالکل غلط قسم کی توجیہ و تشریح ہے بلکہ اِس کے بالکل برعکس جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا یہ ایک پیغام ہے ہمیں خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا۔

تقدیر اور قسمت سے متعلق بھی ایک بالکل غلط قسم کا مفہوم ہمارے دلوں میں گھڑکے ہوئے ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے آجکل کے مسلمان بہت زیادہ تقدیر پرست ہو چکے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہی اِن کی انتہائی پستی کا باعث ہے۔ لیکن ہمیں بحقیقت اور دماغوں نے بھی اسلامی کھڑ میں تقدیر کے صحیح معنی نہیں سمجھے اور اُممیں نے بھی تقدیر کے عام بازاری معنوں ہی کو اپنا کر اسلامی کھڑ کا یہ اہم پہلو غلط طریقے پر پیش کیا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لیس لایا انسان الا باسعی یعنی انسان کی تقدیر بھی بدل سکتی ہے جب وہ خود ایک

کے لئے جدوجہد کرے۔ اب اگر ہم اس آیت کی تشریح یوں کریں کہ انسان کا کام صرف کوشش کر دینا ہے، نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہی ہے، یعنی ایک دفعہ کوشش میں ناکامی کو قسمت کی خرابی یا اللہ کے سازگار نہ ہونے کا بہانہ بنا کر کوشش و جہت کو ہی چھوڑ دینا اور سمجھنا کہ یہ عین اسلامی شی ہے تو یہ بالکل غلط مفروضہ ہے۔ اس آیت کا صحیح مفہوم اور اسلامی کچھر کی رو سے یہ ہے کہ ہر مشکل پر قابو پالینا ہماری تقدیر ہے اور اُس کے لئے جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہمارے راستے کی رکاوٹ کتنی ہی بڑی سے بڑی کیوں نہ ہو اُس پر قابو پالینا مرد و مومن کی تقدیر ہے۔ البتہ طریقہ کار یہ ہے کہ جتنی بڑی مشکل ہو اُسی قدر زیادہ جہت اور محنت اور پامردی، ہوشیاری اور زیرکی کی ضرورت ہے۔ اگر ہم غلام رہے تو اللہ تعالیٰ کو ایسا منظور نہ تھا بلکہ یہ سب کچھ خود ہماری کوتاہیوں اور خامیوں کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص اور ہر قوم کے لئے یکساں وسائل پیدا کئے ہیں۔ اگر ہم اپنی کالائقیوں کی وجہ سے اُن سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی قسمت پر الزام دھریں تو ہم اسلامی ثقافت پر نہیں بلکہ کافرانہ ثقافت پر انحصار کیئے ہوئے ہیں۔

قدیم یونانی معاشرہ کا انحصار زیادہ تر تھیوری پر تھا۔ اُن کے غلام سفروں کی بنائی ہوئی Theories جو غیر محسوس اجزاء پر بنائی گئی تھیں اُس زمانے اور علاقے میں درست ثابت ہوئی ہوں گی لیکن اُن کو جوں کا توں جہز مانے اور ہر علاقے میں منطبق کرنا درست نہیں اس کے برعکس اسلام حقائق اور جہز مانے اور ہر علاقے کی ضروریات کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس میں Dogmatic یا تھیوری پر مکمل انحصار کی گنجائش نہیں بلکہ Pragmatic یعنی ہر تھیوری کی عملی صورت مرقب کرنے پر جو حقائق کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی ہو، اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اسی وجہ سے اجتہاد کا نظریہ اسلامی کچھر کا ایک اہم اصول ہے۔ اسلام ایک جامع مذہب نہیں بلکہ ایک متحرک اور ہر لمحہ آگے کی طرف حرکت کرنے والا قتال مذہب ہے۔ لہذا اگر دو پیش کے

حالات کا مطالعہ کرنا ہر ترقی یافتہ معاشرہ کے اچھے پہلوؤں سے خواہ مخواہ چھپا کرنا اور بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کر کے اُن سے تعلیم کی اختیار کرنا اور اسلام کی اُمور کی وقت اور علاقے کی مناسبت سے جدید سے جدید منطقی تشریح پیش کرنا اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ اگر قرآن کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اُس کی تشریح و تفسیر کے مسئلے میں گذشتہ علمائے دین کی تفاسیر سے سُرُوحی اختلاف کفر ہے تو یہ بیحد ہی بذاتِ خود کُفر ہوگی نہ کہ اس کے برعکس۔ باقی علوم کی طرح دین بھی ایک متحرک علم ہے اور اس حیثیت سے کہ قرآن ایک ممکن ضابطہ حیات ہے اس کی متحرک توجہات اور تشریحات جو اجتہاد پر مبنی ہوں انتہائی ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ایک کارخانہ میں اگر ہر سال یا ہر عہد میں اگر ہم جدید ترین مشینری نصب نہ کرتے جائیں تو بہت جلد وہ اپنی (OUT DATED) یعنی وقت سے پیچھے رہ جائے گی کہ دیگر جدید ترین مشینوں سے لیس کارخانوں کا مقابلہ ہرگز نہ کر سکے گی اور بالآخر اپنی موت آپ مر جائے گی۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ہر مشینری کی جانچ پڑتال اُس کا فرض ہے۔ کیسے ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی مشینری انحصار نہ فیکٹری میں لگادی جائے تو اس کی ترقی کی بجائے اس کی تباہی کا باعث ہو۔ اجتہاد کے لئے (INDUCTIVE INTELLECT) یعنی تجرباتی عقل و شعور کو کام میں لانا اور معاشرے کی فلاح کے لئے اسلامی اُمور میں جدید ترین تقاضوں کی روشنی میں نئے معنی و معجزہ کے لئے جدوجہد کرنا ہی اجتہاد ہے اور دینِ اسلامی کلچر کا حصہ ہے۔

قرآن کی تعلیمات میں منطقی دلائل اور تجربے پرست زور دیا گیا ہے اور اسی طرح منطقی اور تاریخی کے مطالعہ اور اُن سے بہت سیکھنے کا جائز انتہائی پُر زور الفاظ میں ذکر ہے۔ پس ظاہر ہو کہ جدید علوم جن سے یورپی اقوام نے اس قدر زیادہ ترقی کی ہے بلا واسطہ اسلامی کلچر کے اثر کے ذریعے ہی اُن تک پہنچے ہیں اور اگر ہم اُنہیں محض یورپین الا اصل

سمجھتے ہوئے ان سے خواہ مخواہ کنارہ کشی اختیار کر لیں تو یہ کوئی اسلام نہیں۔ اس کے برعکس اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ جدید علوم کی اصل یورپ ہی سے منسوب ہے تو بھی اسلام ہرگز یہ نہیں سکھا تا کہ ہم ان سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ علم چاہے چین ہی سے کیوں نہ حاصل ہوا ہو ہم وہاں بھی جائیں اور اُس سے استفادہ کریں۔ غرض جدید علوم کا بغور مطالعہ کر کے اُن میں سے مفید اور کارآمد چیزوں سے خوشہ چینی کر لینا بین اسلامی دُعا کے مطابق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم انہیں جوں کا توں آسانی صحیفہ ہی مان لیں بلکہ اچھی عقل و فہم کو مکمل طور پر بروئے کار لاتے ہوئے ہم اُن میں مزید اضافہ اور بہتری کی صورت پیدا کر سکتے ہیں تاکہ مظاہرِ فطرت پر مکمل طور پر قابو پانا ہمارا مقصد رہن سکے۔

اسلام ششماہیت اور کلیسائیت پر یقین نہیں رکھتا۔ آنحضرتِ مسلم نے بادشاہت کو ختم کیا اس کے ساتھ ساتھ کلیسائیت اور دہبائیت کی بھی مذمت کی۔ یہ دونوں ادارے یورپ کی تہذیب کے بنیادی ستون ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نسلِ امتیاز اور قوم پرستی اُن کا شعار ہے۔ مگر اُن نے اس کی بھی مذمت کی۔ یورپ کے اسی معاشرہ کی وجہ سے اُن کے اپنے ملک میں بھی غریب مسکین کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ اور ان کے علاوہ غیر ملکیوں میں بھی نسلی برتری کا بہانہ بنا کر غریب اور کمزور اقوام کا خون نہایت بے دردی و سفاکی سے لالچِ مہیت کے نام پر چوسا گیا۔ اسلام بادشاہت، کلیسائیت اور لالچِ مہیت اور نسلِ امتیاز سب کے خلاف ہے۔ خلافتِ راشدہ کا دوریں صد ہمارے لئے ایک شاندار اور نادر مثال ہے جو مندرجہ بالا اُمور کے پیشِ نظر وضع کیا گیا تھا اور جس میں خلاصی معاشرہ کی بنیاد بدل و مساوات پر رکھی گئی تھی۔

اگرچہ نبوت کا نادر آنحضرتِ مسلم کے ظہور اور قرآنِ حکیم کے مدد کے ساتھ ہو چکا ہے لیکن صوفیانہ تجربہ ختم نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ کا ایک طویل سلسلہ اسلام میں آنحضرتِ مسلم کے بعد

عہودِ پذیر ہوا جنہوں نے روحانی پاکیزگی اور دینی لوحِ انسان کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور ریاضت، عبادت اور سوچ بچار کا ایک طویل مرحلہ طے کیا اور اپنی اندرونی آواز پر لبیک کہتے ہوئے لوگوں کے لئے مختلف دنیاوی و دینی مقاصد کے حصول کے لئے مشعلِ راہ بنے۔ قرآن نے نفسِ بعین اپنی ذات اور آفاقی دونوں کو علم کے اہم ذرائع قرار دیا ہے۔ بعین جیسے ہم مظاہرِ فطرت اور آفاقی عناصر کے مطالعے سے اپنی بہتری کے لئے علوم و فنون حاصل کرتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ سے نوگاہ کر اور خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر اگر گہری سوچ و بچار کسی مشکل مسئلے پر کی جائے تو اللہ تعالیٰ اُس نیک شخص کو روشنی اور ہدایت سے نوازا ہے اور اگر وہ اُن تجلیاتی ہدایات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر انسانیت کے سامنے پیش کرے تو اُس کی خدمات قابلِ قدر ہوں گی اور یہ بھی حصولِ علم کا ذریعہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ نبوت کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جذبات کو ممکن طور پر استدلال سے بدل دیئے کا حکم ہے۔ بلکہ استدلال کے ساتھ جذبات کو بھی اپنا پارٹ ادا کرنا ہے۔ جدید علوم کے ساتھ ساتھ روحانیت سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ استدلال کی کسوٹی کا یہ فائدہ ہے کہ اس کے ذریعے کسی بھی نظریہ کو چاہے وہ روحانیت کی شیر سی کے ذریعے حاصل ہوا یا جدید علوم کے ارتقا کے باعث پرکھا جاسکتا ہے اور کسوٹے اور کھرے کی تیز کی جاسکتی ہے پس سو فیاض تجربات ایک کا خلاِ تقدی تجربہ میں جن سے استفادہ کرنا ہمارا حق ہے اور اُن پر اعتقاد نہ رکھنا ایک حتمی علم سے استفادہ نہ کرنے کے مترادف ہے۔ اسلام میں سو فی اہم نے سو فی تجربات کو باقاعدہ ترتیب دے کر ایک خصوصی علم کی شکل دی ہے۔ ابنِ خلدون نے اسے محقق طور پر سائنسی اصولوں پر مستند کیا۔ انہی ذریعہ اصولوں کے نتیجے میں جن کا ادوار ذکر کیا گیا دنیا سے اسلام میں سلسلہ ہائے سفینا کے شاندار کارناموں کے علاوہ علمِ حساب، علمِ نجوم، علمِ طب، فلسفہ، استدلال اور دیگر جدید علوم

میں مسلمانوں کے کارہائے نمایاں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ بہت حد تک انہی کے اثر کی مرہونِ منت ہے۔ نظام نے سب سے پہلے یہ اصول وضع کیا کہ شک کا اصول ہی ہر علم کی ابتدا ہے۔ خزانے نے اس کی مزید توضیح کی۔ علوم و ریاضیات کے احیاء کے سلسلے میں اپنے اصول وضع کئے اگرچہ وہ استدلال کے فن میں ارسطو کا پیروکار تھا۔ ابن حزم اور ابن تیمیہ نے استدلال کے میدان میں البرہونی اور القندی نے نفسیات کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ابن تیمیہ اور ابن حزم نے علومِ سائنس و ہنر کے سلسلے میں اور اسی طرح سیکڑوں مسلمان سائنس دانوں نے دُنیا سے اسلام کی رہبری کی جس سے چارہ انگبِ عالم میں اسلام کا ڈنکا بجا کئی دہائیوں کو اب ہم دوبارہ اپنی مسلسل جدوجہد سے اپنی عظمتِ رفتہ کو حاصل نہ کر سکیں۔ معرفتِ بہت مردان کی ضرورت ہے اور احساسِ کسری کو ختم کرنے کی۔

شاعر کا خواب

علامہ اقبال نے اگرچہ اپنی عمر نہ پائی کہ وہ پاکستان کو اپنی نظروں کے سامنے بننا ہوا دیکھ سکتے۔ لیکن پاکستان کا قیام بہت حد تک انہی کی کوششوں کا سرہونِ منت ہے۔ جہاں اپنی شاہری کے قدیمے علامہ نے مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دیا اور انہیں بحیثیت فرد اور ملت اپنے احیاء پر آگایا۔ وہاں انہوں نے اسلامیات ہند کے لئے ایک الگ وطن کے قیام کا تصور بھی پیش کیا۔ کون جانتا تھا کہ شاعر کا یہ خواب ایک دن حقیقت کا روپ دھارے گا۔ اُن کا سیاسی شعور نہایت مضبوط تھا اور وہ مسلم لیگ کے صدر بھی منتخب ہوئے اور مختلف اجلاس میں اپنے خطباتِ مدّار میں انہوں نے اس طریقہ ملک کے قیام کی پیش گوئی اتنے واضح طور پر اور اتنے درست طریقے پر کی ہے کہ اُن کے خیالات پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آئے والے واقعات کیسے آئینے کی طرح اُن کی نظروں کے سامنے واضح تھے۔ بیاہوں کہئے کہ انہوں نے حالات کے دھارے کو اس طرح دلی جذبے کے ساتھ پھیر دینے کی سعی کی جس میں بالآخر مسلمانوں کو کامیابی و کامرانی

ہوئی اور شاعر کا خواب پورا ہو کر رہا۔ موت سے پہلے علامہ اقبال نے قائد اعظم سے متاثر ہو کر کئی بار اُن کا ذکر خیر کیا اور اُن سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کیں۔ اُن کی یہ اُمیدیں بھی کس قدر درست ثابت ہوئیں کہ پاکستان کا قیام یعنی شاعر کے خواب کی تعبیر اُنس کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئے۔ اُن اُذیاءِ مسلم لیگ کے اجلاس مُنتقدہ الا آباد مودھ دسمبر ۱۹۴۳ء میں اُنہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں واضح طور پر اپنے خواب کی تصویر پیش کی۔ اُنہوں نے فرمایا کہ مذہب کو ایک نجی معاملہ سمجھنا غلط ہے اور اگر ایسا سمجھا گیا تو اسلام کا بھی وہی حشر ہو گا جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تختی کے تو برقرار رکھیں لیکن اُن کے نظام سیاست کی بجائے اُن قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان نہیں۔ اجتماعی ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی اور ذاتی ہیں اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مُشرّب و جہانیت ہے جس نے دُنیا سے مادیت سے مُنہ موڑ کر اپنی تمام توجہ عالم رُوحانیت پر جمائی ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں اُلتھام ہوا اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی دلتا نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس کے باہر اس کے گہرو و پیش کی معاشرت پر اُن کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی بُنیاد پڑی جس کے اندر قانونی تصورات مُصنّف تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کی بُنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہذا

اسلام کے مذہبی نصب العین اُس کے معاشرتی نظام سے جو خود اُسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سے پرغور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ جو کسی وطنی یا قومی اصول پر جو اسلام کے اصول و اتحاد کی نفی کرنے پر مبنی ہو۔

مشہور فرانسیسی عالم RENAN (رینان) کا توں ہے کہ انسان نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے مذہب کی نہ دریاؤں کا بساؤ اُس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے نہ پہاڑوں کی سمیتیں اُس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ مگر صبحِ الدماغ انسانوں کا ایک زبردست اجتماع موجود ہے اور اُن کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو اُنہی کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے جو ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طویل اور صبر آزمائے عمل ہے اس لئے کہ اس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کے دین الہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جائیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور عقیدہ جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماع پر قائم رہے۔ لہذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے لئے کسی قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندوستان کی کوئی جماعت تیار نہیں۔ تو میتِ ہند کا اتحاد اُن تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ اُن کے

تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ مسیحی مذہب کا تقاضا ہے کہ ہم حقانیت کا خواہ وہ کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں احترام کریں۔ حصولِ مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو ذہن میں کر لیا جائے جو واقعہً موجود نہ ہو۔ ہندو طبقہ کا یہ یہونا چاہیے کہ ہم واقعات کی تکذیب کی بجائے اُن سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں۔

ان حالات کی روشنی میں علامہ اقبال نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان اور ایشیا کی قسمت ستر اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیتِ ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندوستان کو چھٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اہل ہند کا ایک حصہ اپنی تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مشرقی اقوام سے مشابہ ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ ان قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے اندر اشتراک و تعاون کی کوئی نئی راہ نکل آئی تو اُس سے نہ صرف اس قدیم ملک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافیائی حیثیت کے باعث ایک عرصہٴ دداز سے معائب و فتن کا غمخیز مشرق بن رہا ہے اصلح و آشتی قائم ہو جائے گی بلکہ اس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل 'زبان' مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اُن کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں ہے۔ اگر کسی طرح میں نامناسب نہیں کہ مختلف بھتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ آلِ پادشیر مسلم کا نفوس کی قراردادوں سے اسی نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف بھتوں کے وجود کو فنا کئے بغیر اُن سے ایک متوافقِ اہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے

ساتھ اپنی ان صلاحیتوں کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لاسکیں۔

ملازمہ اعتبار نے اپنے خطبے کے دوران فرمایا کہ ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو نہر دکن میں بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اراکینِ مجلس نے اسے اس بنا پر روک دیا کہ اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہو گا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبہ کا لحاظ کیا جائے تو اراکینِ مجلس کا یہ خیال صحیح ہے لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی۔ غالباً قسمت انبالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ اس تجویز کو سن کر وہ انگریز کو پریشان ہونا چاہیے نہ ہندوں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے مزدی ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور جاندار طبقہ کا مرکزیت کی بدولت جس نے دولتِ برطانیہ کی نا انصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا کہ وہ اس ملک پر اپنی حکومت قائم رکھیں، ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا، بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساساتِ ذمہ داری قوی

ہو جائیں گے امداد کا مہذب و حب الوطنی بڑھ جائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقع دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جس سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشوونما اور ارتقاء میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام ہر دینی حلوں کے خلاف خواہ وہ حملہ بزرگ قوت ہو یا بزرگ خیالات ہندوستان کے بہترین ماحول ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۶۷ لاکھ ہے اور اگر ہمسایہ ہند کی کل تعداد میں سے ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو خیال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد ۶۲ فی صدی ہو جائے گی حالانکہ اس انداز میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں جو بلوچستان اور صوبہ سرحد سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ اُن تمام سلامتیوں کا بہ آسانی اندازہ کر سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چھوڑ دیتوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔

مقامہ اقبال نے اس سلسلے میں ہندوؤں کے خدشات کو ختم کرنے کی سعی میں فرمایا کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ایک طرف کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کوئی کلیسا کی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا انحصار دوسرے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقیدہ اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و پھر کی طرح کسی خاص زمین سے مربوط نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اُس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ "ٹائٹلز آف انڈیا" کے اُس اقتدار سے کیا جاسکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا فرض تھا کہ سُور کے مُتعلق قوانین بنائے لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سُور لینا حرام ہے، اسلامی حکومت نے شرح سُور پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں۔

مقامہ اقبال نے فرمایا کہ میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ابنِ اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمہور کو توڑ ڈالے جو اُس کی تنہا تھکنِ شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف اُن کے صیغِ معافی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ نہادِ سال کی مدح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

اپنے خطبہ کے دوران ایک اور جگہ سندھ کے مصوبہٴ یمنی سے علیحدہ کیے جانے کے حق میں اُنہوں نے یوں دلائل دیئے:-

املاہ یمنی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ اہلِ سندھ کی زندگی اور اُن کا تعلق عراق اور عرب سے مشابہ ہے نہ کہ ہندوستان سے بشمول اسلامی جغرافیہ وہاں مسعودی نے آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اسی مشابہت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ سندھ وہ ملک ہے جو ملکِ اسلامی سے قریب تر ہے۔ سب سے پہلے اُموی خلیفہ کا قول تھا کہ مصر کی پشتِ افریقہ کی جانب ہے اور اُسے عرب کی جانب۔ مناسب رد و بدل کے ساتھ یہی بات سندھ کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ سندھ کی پیشہ ہندوستان کی طرف ہے اور اُسے وسطِ ایشیا کی جانب۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے ابنِ زراعت مسافِ کاجن سے حکومتِ یمنی کو مطلق ہمدردی نہیں اور اُس کی بے شمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ رکھ لیا جائے، اس لئے کہ کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا دارِ سلطنت بن جائے گا تو صاف نظر آتا ہے کہ اس کو املاہ یمنی سے ملحق رکھنا مصلحتِ اندیشی سے کس قدر دور ہے گا۔ بیشک اس وقت یمنی کا دورِ دوستانہ ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ کل ہی اس کا حریف بن جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس

راہ میں کچھ مالی مشکلات حاصل ہیں لیکن اس تک تو کوئی مستند بیان نظر سے نہیں گزرا لیکن فرض کر لیجئے کہ اس قسم کی مشکلات موجود ہیں لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ حکومت ہند اُمید افزا ہو۔
گو اپنی آنا وائر ترقی کی جہد و جہد میں عارضی طور پر مدد نہ دے۔

فرض ملامہ اقبال کے سیاسی نظریاتِ اسلامیات ہند کے مستقبل کے مرتبے سے تعلق نہایت طبع اور دودھ دس تھے۔ اُنہوں نے حالات کی بغض پر صبح جگہ ہاتھ دکھا اور مسلمانوں کو وہ نصب العین دینے میں استثنائی جرات مندی اور بانی نظری کا ثبوت دیا جن کو اپنا کر بالآخر اسلامیات ہند نے اپنے لئے ایک طبع و وطن تعمیر کر لیا اور اس طرح شاعر مشرق کا خواب بھی شرمندہ تعبیر ہوا۔



● ملک محمد عظیم ، ۱۷ مئی ۱۹۲۹ء میں پیدائش ہوئے۔ آبائی وطن ضلع راولپنڈی ہے۔ گرو والد رحمہ اللہ نے ان کے بابت ہندوؤں کے مختلف شعروں میں لکھا ہے اور گورکھ پور میں ان کے کئی شعروں کے مقابلے کے امتحان میں کامیابی کے بعد انھیں ان کی لازمت چھوڑ کر راولپنڈی میں (۱۹۵۵ء) ان کے ساتھیوں کے ساتھ تباہی سے پاکستان کے بیشتر شعروں

میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں مقرر، مضمون نگار، ایڈیٹر، بستی بھائی تھے۔ تب سے اب تک علمی ادبی ذوق کی تحریک میں مضمون نگاری کرنے کے ساتھ علمی مجلسوں کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ زبردستی خیال کے نام سے تنقیدی مقالات کا مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔

● لطیفہ خانم صدیقی (عظیم ملک محمد عظیم)



۱۹۲۲ء میں ڈرہٹ سٹوڈینٹس (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد ڈاکٹر تھے۔ بریلی سے بسمتہ لاہور میں تعلیمات ہے ابتدائی تعلیم راولپنڈی (پنجاب) میں حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے، گورنمنٹ کالج کراچی سے ایم۔ اے۔ لے گورنمنٹ کالج فار ویمن کراچی سے بی۔ اے اور کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا اور کچھ عرصہ گورنمنٹ کراچی کالج کراچی میں بطور لیکچرار کام کیا۔ دوران تعلیم مضمون نگاری، ایڈیٹر اور طلباء کی انجمنوں کی لیڈر رہیں۔

۱۹۵۶ء میں محمد عظیم ملک سے شادی ہوئی۔ قیام راولپنڈی کے دوران اپنی سرگرم کارکن اور پرائیڈ سیکرٹری تھیں پھر ساکوٹ، گجرات میں بھی ایسی ہی خدمات انجام دیتی رہیں۔

اس سے پہلے اپنے گرامی قدر شعروں کی علمی ادبی تحریکوں میں ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ البتہ اسے کتاب میں ان کے ساتھ برابر شریک ہیں۔

چار بچوں عظیم، تقار عظیم اور دو بچیوں شہلا عظیم اور تنسیم عظیم کے ماں ہیں +